اترپردیش اردو اکادمی
उत्तर प्रदेश उर्दू अकादमी

سہ ماہی

اکادمی

جنوری۔مارچ ۲۰۲۵ء

اُترپردیش اردو اکادمی، لکھنؤ

اترپردیش اردو اکادمی

سہ ماہی

اکادمی مجلّہ

جلد نمبر۲۲ جنوری-مارچ ۲۰۲۵ شمارہ نمبر۳

ایڈیٹر : شوکت علی (سکریٹری)

معاون : ممتاز احمد (سپرنٹنڈنٹ)

رسالے کے مندرجات سے اترپردیش اردو اکادمی کا بہ ہر صورت متفق ہونا ضروری نہیں

زرسالانہ: پچاس روپے-/50 قیمت فی شمارہ : پندرہ روپے-/15

خط وکتابت اور ترسیل زر کا پتہ

سکریٹری، اترپردیش اردو اکادمی

وبھوتی کھنڈ، گومتی نگر، لکھنؤ۔226010، فون نمبر 0522-4022924

upurduakademi3@gmail.com

www.upurduakademi.in

شوکت علی، سکریٹری، ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر نے میسرس اے۔ ایس انٹرپرائزز، نبی نگر چکدادن پور، کاکوری، لکھنؤ سے چھپواکر اکادمی کے دفتر واقع وبھوتی کھنڈ، گومتی نگر، لکھنؤ-226010 سے شائع کیا۔

ترتیب

اداریہ	ایڈیٹر	۳
پریم ناتھ پردیسی: کشمیر کا معروف افسانہ نگار:	ڈاکٹر ریاض توحیدی کشمیری	۰۵
جانشینِ داغ دہلوی: بسمل عظیم آبادی:	سلطان آزاد، پٹنہ	۱۶
رقص جنوں اور گردش ایام کا شاعر: ملک زادہ منظور احمد	محمد اویس سنبھلی	۲۶
ارشد منیم کی افسانہ نگاری کا تجزیاتی مطالعہ:	کہکشاں عرفان	۳۵
ظفر گورکھپوری کی شاعری:	غلام قادر	۵۳

❖❖❖

اداریہ

اردو زبان وادب کی اپنی کثیر الجہات خوبیوں کی وجہ سے دنیا کی دیگر زبانوں کے درمیان اپنی ایک الگ شناخت ہے۔اپنی عوامی مقبولیت کی وجہ سے یہ زبان مختلف مسائل کا شکار رہی ہے جن کے تدارک کا کوئی حتمی امکان نظر تو نہیں آتا،لیکن اس کی ترقی اور فروغ کے لیے مسلسل کوششیں جاری ہیں۔

اردو زبان ہندوستان میں پیدا ہوئی۔یہیں پلی بڑھی اور آہستہ آہستہ پورے ملک ہی نہیں بلکہ بین الاقوامی سطح کی زبان قرار پائی-اردو صرف زبان نہیں تہذیب ہے۔اپنی تہذیب کے باعث ہی یہ زبان زندہ ہے اور ہمیشہ زندہ رہے گی۔یہ زبان قومی یکجہتی کی علامت ہے۔اپنی فعالیت ونزاکت اور شیرینی سے لوگوں کے دلوں پر چھا جاتی ہے۔اس کے تحفظ اور بقا کے لئے بہت سے ادارے اور تنظیمیں کام کر رہی ہیں۔حالانکہ بعض تنظیمیں اور ادارے ایسے بھی ہیں جو اردو کے نام پر صرف فائدہ اٹھا رہے ہیں،جنھیں نہ تو اردو سے کچھ سروکار ہے نہ ہی زبان وادب کے فروغ سے کچھ مطلب۔ان کے لئے تو اپنے مقصد کا حصول ہی سب کچھ ہے۔اسی طرح کچھ نام نہاد شاعر وادیب نیز نقاد خود نمائی کے جذبہ کی تسکین اور سستی شہرت کے لئے صرف کاغذی تقریبات کے انعقاد کو ہی ادبی مشغلہ تصور کرتے ہیں۔وہ جھوٹی خبریں اور تصویریں رسائل واخبارات میں شائع کرانے کو ہی بڑا کارنامہ تصور کرتے ہیں اور یہ باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں کہ یہی اردو کے سب سے بڑے ہمدرد اور بہی خواہ ہیں۔

اس کلیہ سے کیسے صرف نظر کیا جا سکتا ہے کہ کسی بھی زبان وادب کا معیار اس کے تخلیقی ادب کے ذریعہ ہی متعین کیا جاتا ہے۔اردو زبان وادب کو جو غیر معمولی شہرت حاصل ہے وہ ہمارے شعراء،ادباء،ناول نگاروں،افسانہ نگاروں،ڈرامہ نگاروں،طنز ومزاح نگاروں،خاکہ نگاروں وغیرہ کی محنتوں کا ثمرہ ہے۔خوشی کی بات ہے کہ کچھ تخلیق کار عہد حاضر میں بھی کسی صلہ کی پروا کئے بغیر اپنی خدمات سے اردو زبان وادب کو فیض پہونچا رہے ہیں۔اس سلسلہ میں محققین

اور ناقدین کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ہمارے ناقدین و محققین بھی ادب کے فروغ میں اہم رول ادا کر رہے ہیں۔ ملک کی تمام اردو اکادمیاں بھی ایسے تخلیق کاروں، نقادوں، صحافیوں کی حوصلہ افزائی کر کے ان کو انعام و اکرام سے نوازتی ہیں۔ شعراء و ادبا ہی سماج کے مختلف مسائل کو اپنی تخلیق کے ذریعہ اجاگر کرتے ہیں۔ یہی افراد قوم و معاشرے کو ایک سمت دیتے ہیں۔ اردو کی تاریخ کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ بات واضح ہو جائے گی کہ اردو نے مختلف تحریکات کے ذریعہ ادب کو مالا مال کیا، وہ چاہے اصلاحی تحریک ہو یا رومانی تحریک، ترقی پسند تحریک ہو یا جدیدیت کی تحریک، ہر تحریک نے اردو کو مستحکم کیا ہے۔ عہد حاضر کے شعراء، ادباء، ناقدین کی ذمہ داری ہے کہ وہ اردو زبان کے معیار سے کسی بھی طرح کا سمجھوتہ نہ کریں بلکہ بلا خوف سماج کے مختلف مسائل کی عکاسی کے ساتھ فرقہ وارانہ ذہنیت کا مقابلہ کریں کیونکہ قومی یکجہتی و بھائی چارہ ہی ہمارے ملک کو ترقی کی راہ پر گامزن کرتا ہے۔

تخلیقی، تحقیقی و تنقیدی کام کرنے کی جگہ ترتیب و تدوین کے نام پر کتابوں کی اشاعت کا فیشن آج ایک وبا کی شکل اختیار کرتا جا رہا ہے۔ چنانچہ تمام معیارات کو بالائے طاق رکھ کر محض کتابوں میں اضافہ کرنے کی ایک ہوڑ سی لگی ہوئی ہے۔ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ اس طرح کے غیر ادبی عمل سے پرہیز کیا جائے، جس سے نہ تو ادب میں کچھ اضافہ ہونے والا ہے اور نہ ہی زبان کو فروغ۔ زبان و ادب کی ترویج کے سلسلے میں موجودہ عہد میں جو اسکالر تخلیقی، تحقیقی و تنقیدی موضوعات پر معیاری کام کر رہے ہیں ان کی بھرپور ستائش کی جائے۔ معیاری ادبی رسائل بھی زبان و ادب کے فروغ میں اہم خدمات انجام دے رہے ہیں۔ سہ ماہی 'اکادمی' اچھے اور معیاری مضامین کو اولیت دیتا ہے۔ اس شمارے کے مضامین کے سلسلہ میں اپنی رائے سے ضرور مطلع فرمائیں۔

شوکت علی

ایڈیٹر

ڈاکٹر ریاض توحیدی کشمیری

پریم ناتھ پردیسی: کشمیر کا معروف افسانہ نگار

اردو زبان وادب کے ارتقا اور فروغ میں جموں وکشمیر کی خدمات تاریخی حیثیت کی حامل ہیں، جس کے لئے مہاراجہ پرتاب سنگھ کے دور اقتدار میں سرکاری سطح پر 1889ء میں جموں وکشمیر میں اردو کو سرکاری زبان کا درجہ دینا ایک تاریخی اقدام تھا اور اس کے ساتھ ساتھ یہاں کی علمی وادبی اور صحافتی وتدریسی اردو خدمات کا بھی نمایاں رول رہا ہے۔اس طرح گلشن کشمیر اردو کا گلشن بنتا گیا۔جموں وکشمیر اور لداخ کے سیکڑوں ادباء وشعراء، مدرسین ومبلغین، تعلیمی وثقافتی ادارے اور پرنٹ والیکٹرونک میڈیا اردو زبان وادب کی آبیاری کرتے آئے ہیں، جو کہ ایک تاریخ بن چکی ہے۔اس منظر نامے میں اردو فکشن نگاروں کی ادبی وسماجی خدمات کا بھی اہم کردار رہا ہے کیونکہ فکشن کے ذریعے زبان کے ساتھ ساتھ کسی بھی خطے کی تہذیب وثقافت اور مسائل وموضوعات بصورت کہانی وکردار سامنے آتے ہیں جو کہ علم وادب اور تھیوری کے پیش نظر لسانی اور جغرافیائی شعریات (Geopoetics) کے مطالعہ میں آتا ہے۔اردو افسانہ کے ابتدائی منظر نامے میں کشمیر کے جس افسانہ نگار نے فنی وفکری اور موضوعاتی ولسانی سطح پر اردو افسانے میں اپنا ایک منفرد مقام بنایا تھا وہ پریم ناتھ پردیسی (1909-1955) تھا جو کہ ترقی پسند تحریک سے فکری وعملی طور پر بھی وابستہ رہے تھے۔ایک طرح سے اردو افسانے کو ابتدا میں ہی دو پریمی ملے تھے، یعنی بنارس کے پریم چند اور جموں وکشمیر کے پریم ناتھ پردیسی۔اگر کسی کے ذہن میں مبالغہ آرائی کا شبہ پیدا ہو جائے تو وہ پریم ناتھ پردیسی کے پہلے افسانوی مجموعے ''شام وسحر'' (1941ء) میں شامل مولوی

عبدالحق، غلام السیدین اور محمدالدین فوق کے تاثرات دیکھ سکتے ہیں۔ جیسے معروف مورخ اور صحافی محمدالدین فوق کی رائے صفحہ نمبر 12 پر کچھ اس طرح سے ہے:

''وہ اپنی نتیجہ خیز کہانیوں اور مفیدِ ملک افسانوں کی بدولت کشمیر کے منشی پریم چند معلوم ہوتے ہیں۔''

اسی طرح ترقی پسند ادیب سید احتشام حسین نے پریم ناتھ پردیسی کے افسانوں اور کشمیر کے موضوعات پر عمدہ رائے دی ہے کہ:

''کشمیر کے متعلق جو شخص بھی کچھ لکھے گا، اس کا اس زبردست کشمکش کو محسوس کرنا لازمی ہے ورنہ وہ کشمیر کی روح میں نہیں اتر سکے گا۔ پردیسی کے افسانوں میں اس کشمکش کا شعور نظر آتا ہے... پردیسی کو کشمیر کی زندگی، تہذیب اور روایات سے محبت تھی اور ان ہی کو وہ اپنے افسانوں میں پیش کر کے عام انسانوں کی خدمت کرنا چاہتے تھے۔ یہی ایک افسانہ نگار اور انسان کی حیثیت سے ان کی بڑائی ہے۔''

(بحوالہ کتاب 'پریم ناتھ پردیسی۔ عکس در عکس۔ ڈاکٹر محمد افضل میر: ص:168)

پریم ناتھ پردیسی اس زمانے میں کشمیر کے درد و کرب اور مسائل کو پیش کرنے والا ایک ایسا افسانہ نگار تھا جس کے افسانے کئی اہم رسائل اور اخبارات ''رسالہ' ساقی' رسالہ' ہمایوں' رنبیر' وغیرہ میں شائع ہوتے تھے۔ ڈاکٹر برج پریمی کے بقول: ''پردیسی نے کشمیر کو اپنے افسانوں میں پہلی بار پیش کیا اور ہزاروں لاکھوں کشمیریوں کو زبان بخشی۔''

اسی طرح معروف افسانہ نگار نور شاہ نے اپنی ایک اہم کتاب'' جموں و کشمیر کے اردو افسانہ نگار'' کی ابتدا پریم ناتھ پردیسی پر لکھے گئے مضمون سے کی ہے اور ان کی افسانہ نگاری کا احاطہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

''پردیسی نے اپنے افسانوں میں کشمیر کی عکاسی صحیح معنوں میں کی ہے اور کشمیر کی زندگی، تہذیب و تمدن اور معاشرے کو اصلی رنگ و روپ میں پیش کیا ہے...۔'' (ص:38)

پریم ناتھ پردیسی ایک کشمیری ہونے کے ناطے کشمیر کی زندگی کے نشیب وفراز سے واقف تھے‘اس لئے انہوں نے اپنے افسانوں میں کشمیر کی حقیقت نگاری کو کہانیوں کا روپ دے دیا۔ان کے افسانوں کا مطالعاتی کینواس جغرافیائی شعریات (Geopoetics) کے دائرے میں آتا ہے کیونکہ یہ افسانے ایک مخصوص خطے یعنی جموں وکشمیر کی سیاسی وسماجی‘ تہذیبی و تمدنی اور اقتصادی و ماحولیاتی صورتحال کو موضوع بناتے ہیں۔ جغرافیائی شعریات میں جہاں دوسرے موضوعات زیر بحث لائے جاتے ہیں وہیں اس کا ایک حصہ ادب وثقافت کوموضوع بناتا ہے،جو کہ فکشن تنقید کی نظر میں تخلیق کا زمان و مکان (Time and space) ہوتا ہے۔اس میں جغرافیائی حدود کے اندر ایک فکشن نگار کسی خطے کے سماجی و ثقافتی شعور وحالات کی فنی نمائندگی کرتا ہے ۔اس ضمن میں ڈاکٹر فرخ ندیم اپنی کتاب ’فکشن‘ کلامیہ اور ثقافتی مکانیت‘ ‘میں لکھتے ہیں:

”پریم ناتھ پردیسی چونکہ ترقی پسند تحریک سے متاثر تھے اور کشمیر میں اس کی ایک شاخ بھی کھولی گئی تھی تو ان کے اسلوب پر ترقی پسند افسانہ نگاروں کا اثر بھی دکھائی دیتا ہے خصوصاً پریم چند کی طرح کسان اور دیہی موضوعات کی پیش کش میں، اور اُن دنوں ایسے موضوعات پر توجہ دینا افسانے کی کامیابی مانا جاتا تھا۔فنی طور پر پریم ناتھ پردیسی کے افسانے آسان اسلوب کے حامل ہیں، موضوعاتی سطح پر مقامی مسائل و موضوعات پر عمدہ ارتکاز نظر آتا ہے اور کردار نگاری میں مقامی کردار جیسے رمضان، رحیم بٹ، لالہ، راجو، امرتی، نتھو، جواد، انّا، پرساد بٹ، رادھا،سدرشن،موہن لال وغیرہ شامل ہیں۔“

''زندگی کی طرح فکشن کا بھی اپنا ایک جغرافیہ ہوتا ہے۔اس جغرافیے کی حدود وقیود کا تعین اس کے موضوعات کرتے ہیں۔فکشن کی وہ قسم جو سماجی ناول یا افسانہ کہلاتی ہے حقیقت کو تخیل بنانے اور تخیل کو حقیقت بنانے کا فن ہے۔''(ص:89)

'Geopoetics' کی تھیوری ایک معروف ادیب اور شاعر (Kenneth ScottishWhite) نے 1979ء کے دوران پیش کی تھی،جس میں بین مضامین مطالعہ وتحقیق (Interdisciplinary research and study) کے ذریعے کسی بھی خطے کے لینڈ اسکیپ کا زمینی و ماحولیاتی ' سیاسی اور تہذیبی' ثقافتی وادبی جائزہ لیا جاتا ہے۔

Geopoetics کے تناظر میں پریم ناتھ پردیسی کے کئی افسانے اپنا تہذیبی وثقافتی اور موضوعاتی کینواس سمیٹے دکھائی دیتے ہیں' جو کہ ان کے تین افسانوی مجموعوں ''شام وسحر'' (1941ء)''دنیا ہماری''(1951ء)اور''بہتے چراغ''(1955ء)میں شامل ہیں۔

پریم ناتھ پردیسی کا پہلا افسانہ''سچی پرارتھنا''1932ء میں شائع ہوا تھا۔رفتار زمانہ کے ساتھ ساتھ ان کا مطالعہ ومشاہدہ بھی وسیع ہوتا گیا۔سماجی مشاہدے' سیاسی شعور اور ترقی پسند ادب کے مطالعہ نے بھی ان کی فکر وسوچ اور تخلیقی کارگزاری کو ایک معیاری سمت عطا کی اور راجو کی ڈولی 'چوٹی'انسان ساز' پنچایت کا فیصلہ'اگلے سال' کاریگر' ڈھول'اجالے اندھیرے' کتبے'ان کوٹ' سوغات'دیوتا کہاں ہیں'نئی صبح' بہتے چراغ وغیرہ افسانوں کو بہت پسند کیا گیا۔

پریم ناتھ پردیسی چونکہ ترقی پسند تحریک سے متاثر تھے اور کشمیر میں اس کی ایک شاخ بھی کھولی گئی تھی تو ان کے اسلوب پر ترقی پسند افسانہ نگاروں کا اثر بھی دکھائی دیتا ہے۔خصوصاً پریم چند کی طرح کسان اور دیہاتی موضوعات کی پیش کش میں، اور اُن دنوں ایسے موضوعات پر توجہ دینا افسانے کی کامیابی مانا جاتا تھا۔فنی طور پر پریم ناتھ پردیسی کے افسانے آسان اسلوب کے حامل ہیں۔موضوعاتی سطح پر مقامی مسائل وموضوعات پر عمدہ ارتکاز نظر آتا ہے اور کردار نگاری میں مقامی کردار جیسے رمضان' رحیم بٹ'لالہ'راجو'امرتی' نتھو'

جواد'انا' پرساد بٹ' رادھا' سدرشن' موہن لال وغیرہ شامل ہیں۔

سماجی سطح پر ان افسانوں میں کشمیری ثقافت' مسائل' رہن سہن اور آپسی بھائی چارے کی عمدہ منظر کشی موجود ہے۔کئی افسانوں میں روایتی طرز زندگی' سادہ لوح سوچ اور بے لوث محبت واپنائیت کی عمدہ عکاسی کی گئی ہے۔کردار نگاری میں یہ فنی خوبی نظر آتی ہے کہ افسانہ نگار گہرے مشاہدے کا مظاہر کرتے ہوئے کردار ہی کی فکر وسوچ اور نفسیاتی رنگ میں کہانی پیش کرتا ہے۔

افسانہ''راجو کی ڈولی''میں بے لوث پیار ومحبت اور بوڑھے کردار رمضان نائی، جسے گھر والے'لالہ' کہتے تھے،کی نفسیاتی کیفیات کا عمدہ نقشہ کھینچا گیا ہے۔افسانے کی شروعات میں راجو ایک چھوٹی بچی ہوتی ہے۔یہ رمضان نائی کی پوتی ہوتی ہے جس کا باپ مر گیا تھا۔اب رمضان نائی اسی کو دیکھ کر بیٹے کا غم بھول جاتا تھا۔گھر میں رمضان نائی کی بیوی اور بہو بھی ہوتی ہیں۔رمضان نائی بال کٹائی کے علاوہ روایتی دندان سازی کا کام بھی کرتا تھا۔لوگ بھی درد دندان کے وقت اس کے پاس چلے آتے تھے۔ایک دفعہ جب اس نے ایک آدمی کا دانت نکالا تو اس کے منہ سے زیادہ خون بہنے لگا اور وہ بے ہوش ہوگیا۔پولیس کو اطلاع ملی اور رمضان نائی کو عدالت نے تین مہینے کی سزا سنائی۔راجو اسے ہمیشہ بازار سے ڈولی لانے کا کہتی تھی لیکن جب اس کو تین مہینے کی سزا ہوئی تو اس کے دل میں راجو کی بات ہمیشہ ایک درد سا پیدا کر دیتی اور وہ سوچتا کہ تین پیسوں کی ہی تو بات تھی اور راجو ڈولی دیکھ کر خوش ہو جاتی۔ تین مہینے کی سزا کاٹ کر جب وہ گھر لوٹتا ہے تو وہاں کے حالات ہی بدل گئے تھے۔اس کی بہو راجو کو لے کر گھر چھوڑ کر چلی گئی تھی اور کہیں اور شادی کر لی تھی۔رمضان نائی کو سخت صدمہ پہنچتا ہے خصوصاً اپنی پوتی راجو کے جدا ہونے کا۔بیوی کے مر جانے کے بعد رمضان نائی اب زیادہ تنہا ہو گیا تھا۔بارہ برس گزر گئے۔ایک دن بوڑھا رمضان نائی راجو کی شادی کی بات سنتا ہے اور چھپ چھپا کر وہ سرائے پور جاتا ہے۔کسی کے ہاتھ اپنی بہو یعنی راجو کی ماں کو اٹھنیوں سے بھرا رومال بھیج دیتا ہے۔بہو جب رومال دینے والے کے بارے میں پوچھتی ہے تو رمضان نائی وہاں سے نکل چکا ہوتا ہے۔بہو کو سمجھ آتا ہے اور اس کے منہ سے بے اختیار'لالہ'

نکلتا ہے۔انجام میں رمضان نائی کی نفسیاتی کیفیت کا نقشہ یوں کھینچا گیا ہے:

''راجو کی ڈولی برات کے ساتھ ایک راستے سے نکل گئی اور دوسرے راستے سے ایک بوڑھا مڑمڑ کر دیکھتا ہوا جلد جلد جارہا تھا۔نقاروں کی آواز میں اسے اپنا جسم آج ہلکا محسوس ہورہا تھا۔آج اپنی ساری پونجی دے کر وہ اس حق کو ادا کرچکا تھا جو بارہ برس پہلے تین پیسے خرچ کر کے ادا ہوسکتا تھا۔!!''

مفلسی انسان کو فکری و نفسیاتی اور سماجی طور پر بے بس بنادیتی ہے۔اسی لئے کہا جاتا ہے کہ مفلسی خوابوں کی سارق (چور) ہے۔(Poverty is the thief of dreams.)۔مفلسی کے موضوع پر نظیر اکبر آبادی کی فکر انگیز نظم ''مفلسی'' کا پہلا شعر مفلسی کے منفی اثرات کا پورا نقشہ کھینچتا ہے۔میں سمجھتا ہوں کہ یہ شعر مفلسی کے منفی اثرات کو اجاگر کرنے میں سیکڑوں افسانوں، تقریروں اور کتابوں پر بھاری ہے:

جب آدمی کے حال پہ آتی ہے مفلسی
کس کس طرح سے اس کو ستاتی ہے مفلسی

پریم ناتھ پردیسی کا ایک اہم افسانہ ''چونی'' کا موضوع مفلسی ہے۔فنی طور پر افسانہ اپنے عنوان ''چونی'' سے لیکر انجام تک عمدہ فن کاری کا مظاہرہ کرتا ہے کیونکہ موضوع کے مطابق عنوان کا انتخاب اور پھر اسی انتخاب کے مطابق پوری کہانی پیش ہوئی ہے اور موضوعاتی سطح پر مفلسی کے منفی اثرات اور سماجی مشکلات کا انسان کی نفسیات اور زندگی پر کتنا منفی اثر پڑتا ہے وہ افسانے کی کہانی اور کردار نگاری کا عمدہ مشاہداتی و تخلیقی منظر سامنے لاتا ہے اور کرداروں کی نفسیاتی و ذہنی غم انگیز کیفیت قاری کو فکری و اخلاقی طور پر متاثر کئے بنا نہیں رہتی۔افسانہ اس زمانے میں تخلیق ہوا ہے جب چونی، اٹھنی یا ایک روپے کا مارکیٹ ویلیو اچھا ہوتا تھا، جیسے چوَنی کے کھو جانے کے بعد مرکزی کردار بیوہ عورت ''انّا'' کی پریشانی اور چونی کے مارکیٹ ویلیو کا نقشہ یوں کھینچا گیا ہے:

''آج کئی دنوں کے بعد انّا کی شبانہ محنت ٹھکانے لگی تھی اور

ابھی تک انگلیوں میں چرخے کے دستے کا نشان تھا۔چونی کے
ساتھ اس کی کتنی ہی امیدیں لپٹی ہوئی تھیں۔ستّو، سرسوں کا میٹھا
تیل، بمبئی کی چائے، نمک اور کچا پشم! یہ سارا سامان چوّنی کے سولہ
پیسوں کے عوض لانا تھا۔''

افسانہ''چونی'' کشمیر کے ایک ایسے غریب گھر کی دکھ بھری کہانی پیش کرتا ہے جو کہ ایک بیوہ''انّا'' کی پریشان حالی کے دکھڑے پر مشتمل ہے۔افسانے کا دوسرا اہم کردار اس کا چھوٹا بچہ''جواد'' ہے جس کے ہاتھ سے چوّنی قبرستان میں دوسرے بچوں کے ساتھ کھیلتے ہوئے گُم ہو جاتی ہے اور وہ جب گھر آ کر پریشانی کی حالت میں رونی صورت میں یہ منحوس بات ماں کو بتاتا ہے تو افسانہ نگار نے عمدہ تکنیکی حربہ استعمال کر کے افسانے کی ابتدا' چوّنی کھو جانے کا سن کر ماں کی نفسیاتی کیفیت کے متاثر کن منظر سے کی ہے:

''اس پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔جب بیٹے نے رونی صورت بنا کر
کہا'انّا چونی کھو گئی' یہ پہلا واقعہ ہے جب انّا نے اپنی عمر میں ایسی
منحوس خبر سنی اور وہ بھی اس وقت جب اس کا خاوند پچھلے سال ہی ۳ بچے
چھوڑ کر مر گیا اور اس کے گھر میں شب و روز خاک اڑانے لگی۔اس نے
چھاتی پیٹ کر پوچھا....''کہاں؟''

اس طرح افسانہ ابتدا میں ہی سماجی حقیقت نگاری کی عکاسی کرتا ہے نہ کہ صرف تخیل آمیز کوئی فرضی قصہ سنا رہا ہے کیونکہ یہ اُس دور کے کشمیر کے بیشتر لوگوں کی معاشی کمزوری کی وہ سچائی ہے جو آج بھی کشمیر کے بیشتر گھروں کی زندگی کا حصہ بن چکی ہے۔افسانے کی عصری معنویت کے تعلق سے ایک واقعہ یاد آیا، پچھلے سال شہر کے ایک میڈیکل شاپ سے کچھ دوائیں لینی تھیں تو وہاں پر ایک عمر رسیدہ جوڑا دوائی لینے کے لئے لائن میں کھڑا تھا۔سیلز مین نے جب دوائی کی قیمت پندرہ سو بتائی تو شوہر نے بیوی سے کہا کہ پندرہ سو....۔بیوی بیمار تھی' اس کی سانس پھول رہی تھی۔برف باری کے دوران ٹھنڈ کی وجہ سے وہ یہ سن کر اور زیادہ کپکپانے لگی اور کہا کہ ہمارے پاس تو کل ساتھ سو روپے ہیں' دو سو کرایہ لگے گا۔چھوڑو پھر کبھی

دوائی لیں گے اور دونوں میاں بیوی وہاں سے نکلنے لگے۔ مجھے یہ دیکھ کر افسوس ہوا اور میں نے سیلز مین سے کہا کہ ان کو دوائی دے دو۔ دونوں کی آنکھیں آبدیدہ ہوگئیں۔ اس لئے اس افسانے کی موضوعاتی اہمیت آج بھی برقرار ہے۔

''اور ایک جمعہ کو سچ مچ اُسے قبرستان میں چونی ملی، جس پر مٹی کی تہ جم گئی تھی۔ وہ اسے پاکر دیوانی ہوگئی۔ اس نے چونی پہچانی۔ یہ وہی تھی جو کچھ عرصہ پہلے جواد سے کھوگئی تھی۔ وہ دوڑ کر جواد کی قبر پر گئی اور اپنا منہ قبر سے لگا کر بولی۔ 'جواد'۔ چونی مل گئی۔ میرے لال اب نکلو باہر... 'لیکن وہاں کون تھا جو جواب دیتا۔ البتہ اسے محسوس ہوا جیسے کسی نے اندر سے لمبی سانس لی اور کروٹ بدل کر لیٹ گیا۔''

چونی کے کھو جانے کے بعد ماں کی حالت کیسی ہوگئی اور غصے میں آکر وہ کیا کر بیٹھی جس کے بعد بیٹے جواد کی زندگی کیسے موت کے منہ میں چلی گئی وہ اس منظر سے ظاہر ہوجاتا ہے:

''ماں کی ممتا غریبی اور افلاس کے پردوں میں چھپ گئی۔ اس نے اس زور کا طمانچہ جواد کے منہ پر مارا کہ اس کی نکسیر پھوٹی۔ لٹھے کا میلا کرتا خون سے بھر گیا اور روتے روتے اس کی ہچکی بندھ گئی۔''

افسانہ، اسی صدمے سے معصوم جواد کا بیمار ہونا اور پھر مرجانا اور اس کے بعد ایک ماں کا چونی کے ساتھ ساتھ بچے کے مرجانے کی دکھ بھری کہانی سناتا ہے اور مفلسی کے مارے ایک گھرانے کی بے کسی و بے بسی کی دردانگیز کیفیت قاری پر طاری کردیتا ہے۔ فنی اور تکنیکی تناظر میں دیکھیں تو افسانے کا متاثر کن کلائمکس اس اقتباس پر سامنے آتا ہے:

''اور ایک جمعہ کو سچ مچ اُسے قبرستان میں چونی ملی، جس پر مٹی کی تہ جم گئی تھی۔ وہ اسے پاکر دیوانی ہوگئی۔ اس نے چونی پہچانی۔ یہ وہی

تھی جو کچھ عرصہ پہلے جواد سے کھوگئی تھی۔ وہ دوڑ کر جواد کی قبر پر گئی اور اپنا منہ قبر سے لگا کر بولی۔'جواد، چونی مل گئی۔ میرے لال اب نکلو باہر...' لیکن وہاں کون تھا جو جواب دیتا۔ البتہ اسے محسوس ہوا جیسے کسی نے اندر سے لمبی سانس لی اور کروٹ بدل کر لیٹ گیا۔''

افسانہ اگر چہ مذکورہ اقتباس پر متاثر کن پیغام چھوڑ جاتا ہے اور فنی و تکنیکی مہارت کا عمدہ ثبوت فراہم کرتا ہے تاہم افسانہ نگار نے اس کے بعد افسانے میں ایک اور قصہ جوڑ دیا ہے جس میں اب یہ گھرانہ خوشحال دکھایا گیا ہے کیونکہ اتنے برسوں کے بعد بیوہ کے باقی دو بیٹے اب خود کاروبار کرتے تھے اور جب ان کے ہاں کام کرنے والے ایک چھوٹے بچے کی چونی کھوجاتی ہے تو وہ پریشان ہوکر ان لوگوں کے پاس چلا آتا ہے' وہ اسے نئی چونی دیتے ہیں۔ یہاں پر افسانے کے اس حصے میں افسانہ نگار ایک اخلاقی پیغام دے رہا ہے جو پیغام کی سطح پر اچھا ہے تاہم افسانے کے مرکزی موضوع کے فنی تاثر کو متاثر کرتا ہے۔

''افسانہ نگار جب افسانے میں کسی خطے کے موسمی حالات یا اثرات کا احوال بیان کرتا ہے تو وہ جیو پولٹکس کی موسمیاتی بحث کو سامنے لاتا ہے۔ کشمیر میں موسم سرما کی کڑاکے کی سردی اور برف باری کے دوران لوگوں کی مشکلات و مسائل کی کوئی انتہا نہیں ہوتی ہے۔ یہ موسم بیماریوں کی آماجگاہ ہوتا ہے۔ پچھلے کئی برسوں سے اس موسم میں برین ہیمرج اور ہارٹ کی بیماریوں میں اضافہ ہوا ہے۔ ندی نالوں کا پانی تک جم جاتا ہے۔ افسانہ''ماں کا احسان'' بھی ایک تنگ دست ہندو گھرانے کی کہانی سنا رہا ہے۔''

افسانہ نگار جب افسانے میں کسی خطے کے موسمی حالات یا اثرات کا احوال بیان کرتا ہے تو وہ جیو پولٹکس کی موسمیاتی بحث کو سامنے لاتا ہے۔ کشمیر میں موسم سرما کی کڑاکے کی سردی

اور برف باری کے دوران لوگوں کی مشکلات و مسائل کی کوئی انتہا نہیں ہوتی ہے۔ یہ موسم بیماریوں کی آماجگاہ ہوتا ہے۔ پچھلے کئی برسوں سے اس موسم میں برین ہیمرج اور ہارٹ کی بیماریوں میں اضافہ ہوا ہے۔ ندی نالوں کا پانی تک جم جاتا ہے۔ افسانہ ''ماں کا احسان'' بھی ایک تنگ دست ہندو گھرانے کی کہانی سنا رہا ہے۔ افسانے میں کچھ اور بھی مسائل پیش ہوئے ہیں تاہم ایک جگہ کشمیر کے موسم سرما کا احول پیش کیا گیا:

> ''ماگھ کے مہینے میں اس غضب کے جاڑے پڑے کہ خدا کی پناہ! نیچے زمین پر کافی برف موجود تھی۔ اوپر کڑاکے کی سردیوں نے اسے فولاد بنا دیا۔ چلتے دریا منجمد ہو کر رہ گئے۔ سڑکیں بند ہو گئیں۔ کاروبار مدھم ہو گیا۔ بوند بھر بھی کہیں پانی نہ رہا اور انہیں سردیوں کا شکار نتھو بھی ہو گیا۔ بے چارے پر جوتی بیچتے بیچتے سر راہ فالج گرا۔''

پریم ناتھ پردیسی' اس دور کے کشمیر کے گھر گھر کی کہانی سناتے ہیں، جب لوگ سیدھی سادھی زندگی گزارتے تھے اور کشمیر میں ہندو مسلم بھائی چارے یا گھریلو مسائل، جس کی وجہ سے ان کے سماجی شعور اور مشاہدے کے تخلیقی اظہار کا واضح پتہ چلتا ہے، ان کے افسانوں کا بنیادی موضوع ہے۔ افسانے ''چونی'' میں ایک طرف جہاں مسلم گھرانے کی مفلسی کی کہانی ''انا'' اور ''جواد'' کی کردار نگاری میں بیان ہوئی ہے تو دوسری جانب افسانہ ''اپنا سب کچھ'' کی کہانی ''رادھا''، ''سدرشن'' اور ''لچھمن'' وغیرہ کی کردار نگاری ایک ہندو گھرانے کی بپتا سناتی ہے۔

افسانہ ''انسان ساز'' نیم داستانی اسلوب کا حامل ایک تخیل آمیز افسانہ ہے۔ اس میں تخیل کے ذریعے ساری کہانی پیش ہوئی ہے اور کہیں کہیں پرانی داستانوں کا اثر بھی نظر آتا ہے۔ افسانہ ''دیوتا کہاں ہیں؟'' افسوس اور طنز کا حامل عمدہ افسانہ ہے۔ یہ افسانہ بھوکے اور ضرورت مند انسانوں کی بھوک پر انسانوں کا تصوراتی دیوتاؤں کو ترجیح دینے کی کہانی سنا رہا ہے۔ ایک اندھا بوڑھا' ایک بھکارن اور اس کا چھوٹا سا معصوم بھوکا بچہ شام تک کھانے کا انتظار کرتے ہیں لیکن پھر بھی انہیں دیوتاؤں کے آنے تک انتظار کرنے کو کہا جاتا ہے۔ بھلا

دیوتا کہاں سے آتے، یہ مذہبی پیشواؤں کی بنی بنائی رسم تھی۔ ہر مذہب تو انسان کی مجبوری کے وقت کام آنے کی تعلیم دیتا ہے نہ کہ کسی بھوکے ننگے کو چھوڑ کر رسم ورواج اور غلط عقیدے رکھ کر فضول کے کاموں میں دھن دولت ضائع کرنے کی۔ 'ٹیکہ بٹنی' بھی خوبصورت افسانہ ہے۔ان کا ایک افسانہ ''پارسل'' ہے جس کا موضوع کشمیر نہیں ہے بلکہ اس میں سنگار پور میں ایک پوسٹ ماسٹر کی کردار نگاری میں کہانی پیش ہوئی۔

پریم ناتھ پردیسی کے افسانے متنوع سماجی موضوعات پر تخلیق ہوئے ہیں۔کئی افسانوں کا اختتام حوصلہ افزا پیغام پر ہوا ہے جو کہ المیہ کے بجائے طربیہ تاثر چھوڑنے میں مفید نظر آتا ہے۔پریم ناتھ پردیسی ایک کشمیری ہونے کے ناطے کشمیری تہذیب وثقافت اور اپنی مٹی سے والہانہ محبت کرتے تھے جس کی وجہ سے ان کے افسانوں میں کشمیر کی خوشبو جگہ جگہ مہک رہی ہے۔

پریم ناتھ پردیسی کے کئی افسانے پڑھ کر میں حیران ہوگیا کہ اس زمانے میں جب اردو افسانہ ارتقائی مراحل سے گزر رہا تھا، اس دور میں پریم ناتھ پردیسی نے کشمیر میں اتنے خوبصورت افسانے لکھے، جو مقامی رنگ میں رنگے ہوئے ہیں اور فن وموضوع اور زبان وبیان میں عمدہ ہیں۔جیسے افسانہ ''راجو کی ڈولی'' کا عنوان اور پھر اسی موضوع کے تحت پورا افسانہ سامنے لانا۔افسانے میں ڈولی ذو معنی بن کر سامنے آتی ہے اور کلائمکس کو دردانگیز بناتی ہے۔پہلے بچپن کا کھلونا 'ڈولی' اور پھر اسی لڑکی کی شادی کی ڈولی' عمدہ منطقی ربط رکھا گیا ہے۔یا افسانہ 'چونی' کا عنوان اور پھر اسی عنوان کے تحت پورا پلاٹ سجانا وغیرہ۔اسی طرح ان کے کئی افسانوں کی پلاٹ سازی' مکالمہ نگاری' جملوں کی ساخت اور کہانی پن دلچسپ فنی صنعت گری کی عکاسی کرتا ہے۔

❖❖❖

Dr Riyaz Tauhidi Kashmiri
H/No: 108 Wadipora Handwara
Kashmir-193221
Mob-9906834877
drreyaztawheedi777@yahoo.com

سلطان آزاد، پٹنہ

جانشینِ داغؔ دہلوی: نسیمؔ ہلسوی عظیم آبادی

فصیح الملک نواب مرزا خاں داغ دہلوی اپنے دور کے استاذ شعراء میں سب سے زیادہ مشہور ومقبول ہوئے۔ان کی زبان دانی کا شہرہ سارے جہاں میں تھا۔ یہ وہ دور تھا جب داغؔ کی شاعری کا ڈنکا پورے برصغیر میں بج رہا تھا۔جس کے باعث جوق در جوق پورے ہندوستان میں شعرا ان کی شاگردی اختیار کرنے میں فخر اور خوشی محسوس کرتے تھے۔ بلاشبہ داغؔ اپنی شوخ بیانی،مضمون کی نیرنگی،شگفتہ بیانی اور دہلوی ٹکسالی زبان کے استعمال میں حد درجہ امتیاز رکھتے تھے جس کے باعث انہیں شہرت اور مقبولیت ملی۔

1857ء غدر کے باعث داغؔ نے رامپور اور حیدرآباد کا رخ کیا۔اس دوران میر محمد باقرؔ عظیم آبادی کے توسط سے عظیم آباد بھی آئے۔مضمون ''داغ اور بہار'' (مشمولہ مجموعہ مضامین: ذکر ومطالعہ،از پروفیسر ذکی الحق،مطبوعہ 1959ء) میں پروفیسر ذکی الحق نے لکھا ہے:

> ''اب داغؔ کلکتہ کے لئے روانہ ہو گئے۔ پہلے دہلی آئے پھر لکھنؤ پہنچے،کانپور،الہ آباد ہوتے ہوئے عظیم آباد آئے۔میر محمد باقرؔ عظیم آبادی تلمیذ حضرت وحیدؔ الہ آبادی کے گھر قیام کیا۔عظیم آباد میں اپنے قیام کا مختصر تذکرہ خود داغؔ نے اپنی مثنوی میں نظم کیا ہے۔مثنوی کے مطابق داغؔ نے عظیم آباد میں آٹھ دن قیام کیا:
>
> آٹھ دن دیکھی سیر پٹنے کی
> یہ ہوئی وجہ جی اُچٹنے کی۔''

ایک شعر اسی سلسلہ کا ملاحظہ ہو:

میر باقرؔ کے گھر قیام ہوا
خوب دعوت کا اہتمام ہوا

پروفیسر ذکی الحق نے اپنے مذکورہ مضمون ''داغ اور بہار'' میں مزید لکھا ہے:

''حضرت داغؔ، میر محمد باقرؔ عظیم آبادی کے مہمان تھے۔ داغ کے علاتی بھائی مرزا شاہ محمد شاغلؔ خلف مولوی تراب علی متوطن دہلی، میر باقرؔ کے دوست اور ان کے پڑوسی تھے۔ مرزا شاغلؔ داغؔ کے شاگرد بھی تھے۔ وہ عرصہ تک عظیم آباد میں رہے۔ شطرنج بازی میں یگانہ روزگار تھے۔ داغ جس وقت ریل سے اترے عظیم آباد کی خلقت استقبال کے لئے حاضر تھی۔ اس بھیڑ میں مرزا شاغلؔ بھی تھے۔

پیشوائی کے واسطے احباب
آئے تھے شوق دید میں بیتاب''

میر باقرؔ کے متعلق احسن مارہروی کا نوٹ ملاحظہ ہو :

''سید محمد باقرؔ متخلص بہ باقر، شاگرد، وحیدؔ الہ آبادی پٹنے کے شرفا میں تھے۔ موسیقی میں بھی مہارت رکھتے تھے۔ ستار کا بہت شوق تھا۔ اچھے خوش نویس تھے اور وہ اس فن سے آگاہ تھے۔ اس ہم مذاقی نے مرزا داغؔ کو ان کا مہمان بنایا۔''

(بحوالہ: مضمون 'داغ اور بہار' مشمولہ مجموعہ مضامین، ذکر و مطالعہ، از پروفیسر ذکی الحق، مطبوعہ 1959ء)

مختصر یہ کہ داغؔ دہلوی 2 مئی 1882ء کو عظیم آباد (پٹنہ) آئے اور پٹنہ سے ہی یکم جون 1882ء کو نواب رام پور کلب علی خاں کے نام خط لکھا تھا، جس میں دو ماہ کی فرصت طلب کی تھی۔ اس طرح وہ عظیم آباد ایک ماہ سے زیادہ مقیم رہے اور جب تک داغؔ عظیم آباد میں رہے شعری محفل کی ہما ہمی اور گہما گہمی رہی۔ میر باقر عظیم آبادی (رہائش، محلّہ گرہٹہ پٹنہ سٹی) سے

گھر پر ملنے والوں کا سلسلہ رہا۔ ان ہی دنوں حضرت داغؔ دہلوی کے اعزاز میں سب سے پہلا مشاعرہ عظیم آباد میں ہوا جس میں حضرت وحیدؔ الہٰ آبادی کا یہ مصرع طرح مقرر ہوا۔

اِدھر آئینہ رکھا ہے اُدھر وہ تن کے بیٹھے ہیں
جو اپنا دیکھنا منظور ہے کیا بن کے بیٹھے ہیں

داغؔ نے اس مصرع طرح پر اپنی غزل کاتب کو لکھوادی۔ مطلع ملاحظہ ہو۔

بھنویں تنی ہیں خنجر ہاتھ میں ہے تن کے بیٹھے ہیں
کسی سے آج بگڑی ہے کہ وہ یوں بن کے بیٹھے ہیں

یہی وہ دور تھا جب بہار بالخصوص عظیم آباد کے شعرا داغؔ دہلوی سے قریب ہوئے۔ ان کی شہرت کے باعث بہار کے کئی شعرا ان کے حلقۂ تلامذہ میں آگئے۔ پروفیسر ذکی الحق نے اپنے مضمون بعنوان ''داغ اور بہار'' مشمولہ مجموعہ مضامین ذکر و مطالعہ، مطبوعہ 1959ء میں چند شعرا کا مختصراً تذکرہ کیا ہے۔ ان میں نسیمؔ ہلسوی، ڈاکٹر مبارکؔ عظیم آبادی، محمد ریاض حسن خاں خیالؔ، حضرت محمد شاہ حامدؔ حسین اور جناب نظام الدین بلخی قابل ذکر ہیں۔ جبکہ خاکسار (سلطان آزاد) نے باضابطہ ایک طویل مضمون بعنوان ''داغؔ دہلوی اور ان کے بہاری تلامذہ'' میں چوبیس (۲۴) داغؔ کے بہاری تلامذہ اور ان کی شاعری کے جائزہ کے ساتھ نمونہ کلام شامل کیا ہے۔ پیش خدمت ہے عنوان کے

''نسیمؔ کا کل سرمایہ شاعری مطبوعہ اور غیر مطبوعہ گویا تلف ہوگیا۔ تقسیم ہند کے وقت آپ کے صاحبزادگان جب پاکستان منتقل ہوئے تو سامان کی غارت گری میں نسیمؔ کا وہ بکس بھی تھا، جس میں ان کے مسودات اور کچھ مطبوعات تھیں۔ آپ کا پہلا دیوان ''موجِ نسیمؔ'' آپ کی حیات میں ہی طبع ہو چکا تھا۔ دوسرے دیوان ''ریاضِ نسیمؔ'' کا مسودہ بھی مکمل ہو چکا تھا۔ ''بہارِ نسیمؔ'' اور ''فغانِ نسیمؔ'' دو مجموعوں کے مسودات مرتب ہو رہے تھے کہ نزول بلائے الٰہی ہوا۔''

حوالے سے نسیم ہلسوی عظیم آبادی، تلمیذ داغ دہلوی کا مختصر تعارف:

مولانا حکیم سید شاہ محمد نذیر احسن المتخلص بہ نسیم ابن حاجی حکیم سید شاہ امیر اکبر قادری کی پیدائش 29 ربیع الاول روز پنج شنبہ 1292ھ بمقام ہلسہ (پٹنہ) ہوئی۔ ہلسہ ضلع پٹنہ کا معروف قصبہ رہا ہے، جس کی مناسبت سے جناب نسیم ہلسوی نے عظیم آبادی بھی لکھا۔ اب یہ قصبہ ہلسہ ضلع نالندہ میں شمار ہوتا ہے۔ نالندہ ضلع کی ادبی خدمات کے متعلق ڈاکٹر عشرت سلطانہ کی کتاب آئی ہے جس میں نسیم ہلسوی کا تذکرہ شامل نہیں کیا گیا ہے جبکہ وہ داغ کے نہ صرف شاگرد تھے بلکہ ان کے جانشیں بھی تھے اور ایک اہم زود گو شاعر تھے۔

"1915ء میں جب داغ کی جانشینی کا مسئلہ درپیش ہوا تو حضرت نسیم نے اپنے ایک مقطع میں سائل دہلوی کی جانشینی کا اعتراف کرلیا۔ یہ حضرت نسیم کا انکسار تھا، جو اہل بہار کی خصوصیت رہی، لیکن اس انکسار پر بھی مقتدر شعرا نے بہار و بنگالہ کے لئے آپ کو داغ کا جانشیں تصور کیا۔"

نسیم صاحب نے ابتدائی تعلیم اپنے والد سے پائی۔ عربی، فارسی، اردو میں دست گاہ کامل حاصل کی۔ حکمت کے علاوہ شعر و سخن کو اپنا مشغلہ بنایا۔ ان کے کلام کی شہرت کے پیش نظر نواب سلیم اللہ خاں صاحب ڈھاکہ، نے انہیں اپنی کوشش سے کلکتہ بلایا اور مستقل ان سے شاگردی اختیار کی۔ کلکتہ میں ہی رنجور عظیم آبادی جو ان دنوں صدر اکزامینشن بورڈ، کلکتہ تھے، ان کے ساتھ مستقل اوقات گذارے۔ کلکتہ سے مراجعت وطن کی۔ پھر نواب سعادت علی خاں سعادت پیغمبر پور (دربھنگہ) نے بڑی نوازش کے ساتھ آپ کو بلایا اور شاگردی کا شرف حاصل کیا۔ بہت دنوں تک نسیم صاحب نواب صاحب کے ساتھ رہے۔

واضح ہو کہ نواب سعادت علی خاں سعادت پیغمبر پوری بھی داغ کے حلقۂ تلامذہ میں شامل ہوئے۔ احسن مارہروی نے ''انشائے داغ'' کے صفحہ 128 میں ان کے متعلق لکھا ہے:

''نسیم مرحوم ہلسہ ضلع پٹنہ کے رہنے والے تھے اور استاد مرحوم کے بہترین شاگردوں میں تھے۔''

پروفیسر ذکی الحق اپنے مضمون ''داغ اور بہار'' میں نسیم ہلسوی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''حضرت نسیم کی چند غزلیں میری نظر سے گذری ہیں۔ آپ کا کلام اپنے استاد کے رنگ میں ڈوبا ہوا ہے۔ زبان کی صفائی، بیان کی شوخی، محاوروں کی بے تکلفی اور شوکت الفاظ جو داغ اسکول کی خصوصیات ہیں، آپ کے کلام کے اندر بدرجہ اتم موجود ہیں۔''

نسیم ہلسوی عظیم آبادی، داغ کے تلامذہ میں بالخصوص بہار کے حوالے سے بہت ممتاز حیثیت رکھتے تھے۔ آپ کی شاعری کے متعلق ڈاکٹر کلیم احمد عاجز نے اپنی کتاب ''بہار میں اردو شاعری کا ارتقا'' (مطبوعہ 1998) میں لکھا ہے:

''فصیح الملک داغ دہلوی کا طوطی ان دنوں ہندوستان کے گوشے گوشے میں بول رہا تھا۔ غزل بھیجی اور صلاح ومشورہ کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ داغ کے اپنے قلم سے اصلاح شدہ چند غزلیں مجھے ملیں، جن پر داغ بڑی شفقت سے کہیں کہیں ایک آدھ لفظ گھٹا بڑھا دیتے ہیں۔''

ڈاکٹر کلیم احمد عاجز کی اطلاع کے مطابق جناب نسیم کا کل سرمایہ شاعری مطبوعہ اور غیر مطبوعہ گویا تلف ہو گیا۔ تقسیم ہند کے وقت آپ کے صاحبزادگان جب پاکستان منتقل ہوئے تو سامان کی غارت گری میں نسیم کا وہ بکس بھی تھا، جس میں ان کے مسودات اور کچھ مطبوعات تھے۔ آپ کا پہلا دیوان ''موج نسیم'' آپ کی حیات میں ہی طبع ہو چکا تھا۔ دوسرے دیوان 'ریاضِ نسیم'' کا مسودہ بھی مکمل ہو چکا تھا۔ 'بہار نسیم' اور 'فغان نسیم' دو مجموعوں کے مسودات مرتب ہو رہے تھے کہ نزول بلائے الٰہی ہوا۔ متفرق کلام رسالوں اور پرچوں میں چھپتا تھا۔ ایک گلدستہ ''گل تر'، جس میں ایک طرح پر دو غزلیں تھیں، نسیم نے چھپوا کر تمام شاگردان داغ اور دوسرے مشاہر شعراء کی خدمت میں روانہ کی تھی۔ اس دوغزلہ کی

بڑی شہرت ہوئی۔

ڈاکٹر کلیم عاجزؔ نے لکھا ہے کہ ان کے تحقیقی کام کے دوران نسیمؔ ہلسوی کی ایک اہم غزل کاغذات کے پلندے میں دبی دبائی ملی۔ یہ غزل داغؔ کے پاس 24 اکتوبر 1904ء کو بھیجی گئی تھی جسے داغؔ نے کہیں ایک نقطہ کم و بیش کئے بغیر اپنے ہاتھ سے یہ لکھ کر واپس کر دیا ہے ''سبحان اللہ کیا اچھی غزل کہی ہے مجھے بہت پسند آئی''۔ نسیمؔ کی اس غزل کے بارے میں ڈاکٹر کلیم احمد عاجزؔ نے لکھا ہے:

> ''اس غزل میں داغؔ کا وہ تمام رنگ و آہنگ ملے گا، جو داغؔ کی مخصوص انفرادیت میں شمار ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ سب کچھ بھی ملے گا جو داغؔ اسکول کے ایک عظیم آبادی شاگردی میں ملنا چاہئے یعنی کھل کھیلنے والے ماحول میں بھی وہ داخلی نفسی، تہذیب اور شرافت، وہ رندآشامی میں صوفیانہ رکھ رکھاؤ، خالص مجازی معاملہ بندی میں بھی حقیقت کی داخل روح رواں دواں نظر آتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ہلکے ہلکے درد کی کسک۔

بہت صبح سے آج مضطر ہیں ہم
نظر جانبِ در ہے ششدر ہیں ہم
ہمیں دیکھ کر لوٹ جاتے ہیں سب
تیرے بسم اللہ اکبر ہیں ہم
نکالا عبث ذکر حور و پری
وہ کہتے ہیں ان سب سے بہتر ہیں ہم
اسے دل کا دینا ہی ہے اک ستم
ستمگر وہ کیا ہے ستمگر ہیں ہم
قناعت سے کیوں کر نہ ہو دل غنی
کہ اس کی بدولت تونگر ہیں ہم

دہن میں ترے گفتگو ہے ہمیں
بتاتے ہیں باتیں سخنور ہیں ہم
نکالیں کسی ڈھب سے دربان کو
اسی فکر میں تیرے در پر ہیں ہم
وہ کہتے ہیں بت کہتے ہیں سب ہمیں
حقیقت میں کیا کوئی پتھر ہیں ہم
سمجھتے ہیں سب ہم کو افشا نسیمؔ
سعادت علی خاں کے نوکر ہیں ہم''

نسیمؔ ہلسوی عظیم آبادی کے کچھ اشعار نمونۂ کلام کی شکل میں پیش ہیں۔ ملاحظہ ہوں ؎

ہے جس کا خدا حافظ کیا اس کو خطر کوئی
انسان کی کیا طاقت پہونچائے ضرر کوئی

تاکید یہ ہوتی ہے دیکھے نہ ادھر کوئی
مشتاق کی روکے سے رکتی ہے نظر کوئی
کیا جدت تازہ ہے کہتے ہیں نسیمؔ احباب
یہ ہے غزل رنگین یا ہے گل تر کوئی

دل جو لیتے ہو تو لے لو مگر اتنا کرنا
جب سنورنا اسی آئینے میں دیکھا کرنا
قیسؔ و فرہادؔ کے قصوں کی حقیقت کیا ہے
کشور عشق میں اب ذکر ہمارا کرنا

وہ جو سنتے ہوں تمہاری تو یہ سمجھاؤ نسیمؔ

چاہنے والوں کو اچھا نہیں رسوا کرنا

مشکل ہے مرا نشان ملنا
کھویا ہے کسی کی آرزو نے
الزام نہ دیں گے پاسباں کو
روکا تو ہے پاس آبرو نے
ہم مانتے ہیں تری وفا کو
سر دے ہی دیا نسیمؔ تو نے

خواب میں ایک طرحدار کو ہم نے دیکھا
مرحبا طالع بیدار کو ہم نے دیکھا
جس کو سنتے تھے دل آزاد ستمگار نسیمؔ
آج اس شوخ جفا کار کو ہم نے دیکھا

بلاشبہ جناب نسیمؔ ہلسوی عظیم آبادی کا یہ انداز بیاں داغؔ ہی کے گھرانے کا ہے اور داغ سے ہی پھیلا۔ جناب نسیمؔ ہلسوی کے حلقۂ تلامذہ کے متعلق ڈاکٹر کلیم احمد عاجزؔ اپنی کتاب ''بہار میں اردو شاعری کا ارتقا'' میں لکھتے ہیں:

''نسیمؔ کے تلامذہ زیادہ تر مغربی ہند میں رہے۔ نسیمؔ ہلسوی عظیم آبادی اندور، لکھنؤ، رامپور، امرتسر کے مشاعروں میں عزت سے بلائے جاتے۔ وہاں ان کا قیام بھی رہتا۔ ان ہی مقامات پر لوگ آپ کے شاگرد ہوئے۔ بہار میں دربھنگہ اور مظفر پور میں کچھ تلامذہ تھے۔ کچھ ضلع پٹنہ کے بھی تھے، جن میں صرف دو کے نام مجھے معلوم ہو سکے۔ ایک نواب سعادت علی خاں سعادت پیغمبر پور اور دوسرے مولانا نصیر الدین بانی مفتی گنجی عظیم آبادی۔ بنگال میں نواب ڈھاکہ آپ کے

شاگرد تھے۔''

پروفیسر ذکی الحق لکھتے ہیں:

''1915ء میں جب داغؔ کی جانشینی کا مسئلہ درپیش ہوا تو حضرت نسیمؔ نے اپنے ایک مقطع میں سائلؔ دہلوی کی جانشینی کا اعتراف کرلیا۔ یہ حضرت نسیمؔ کا انکسار تھا۔ جو اہل بہار کی خصوصیت رہی۔ لیکن اس انکسار پر بھی مقتدر شعرا نے بہار و بنگالہ کے لئے آپ کو داغ کا جانشیں تصور کیا۔''

اس کی سند میں دو مقتدر شعرا کے خطوط بالترتیب شادؔ عظیم آبادی اور رنجورؔ عظیم آبادی ملاحظہ ہوں:

مکرمی تسلیم! عنایت نامہ نے ممنون کیا۔ عزیزی حضرت سائل مدعمرہ کا کیا کہنا۔ ان کے اخلاق کا میں کلمہ گو ہوں۔ آپ نے ایک دفعہ مجھ کو سرفراز کیا تھا، اور شعر بھی سنائے تھے، مجھ کو یاد ہے۔ ہر چند میں موازنہ کی لیاقت نہیں رکھتا۔ مگر صوبہ بہار کیا دور دور تک آپ جانشیں داغؔ کہے جانے کے مستحق ہیں۔ آپ کی دونوں غزلیں میں نے پڑھیں احسنت احسنت، خدا آپ کو کامیاب کرے۔

(نامہ نگار، خاکسار، سید علی محمد شادؔ، حاجی گنج، پٹنہ 4 جنوری، 17ء)

....

کلکتہ۔ 3 جنوری 1917ء

جناب مولوی سید شاہ نذیر حسن صاحب نسیمؔ ہلسوی عظیم آبادی کا کلام میری نظر سے گذرتا رہا۔ اور میں ہمیشہ اس کے مزہ لیتا رہا ہوں۔ نواب فصیح الملک داغؔ مرحوم کے دوسرے ارشد تلامذہ کے کلام بھی میری نظر سے گذرے ہیں اور میں جناب نسیمؔ کو کسی سے کم نہیں سمجھتا۔ اور میں زور کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اگر تمام ہندوستان میں

نہیں تو کم از کم صوبھات بہار و بنگالہ میں تو اس امر کے مستحق ہیں کہ
جانشیں حضرت داغؔ مانے جائیں۔

(محمد یوسف جعفری رنجورؔ عظیم آبادی،شمس العلماء خان بہادر)

ان دو خطوط کے علاوہ دیگر اور مقتدر شعرا کے خطوط جو حضرت نسیمؔ ہلسوی عظیم آبادی کے بھائی جناب بشیر اکبری ابوالعلائی کے پاس تھے،جن سے ڈاکٹر کلیم احمد عاجزؔ کو ملے تھے،ان مقتدر شعرائے اردو میں اکبر الہ آبادیؔ، ڈاکٹر سر محمد اقبالؔ،آغا شاعر قزلباش دہلوی،حضرت احسن مارہروی وغیرہ تھے۔ان خطوط میں نسیمؔ ہلسوی کو بہار، بنگال اور اڑیسہ میں داغؔ دہلوی کا جانشیں تسلیم کیا گیا ہے۔ان خطوط کا اقتباس اگر چہ ڈاکٹر کلیم احمد عاجزؔ نے اپنی کتاب میں تذکرہ کے ساتھ نہیں کیا ہے،شاید انہوں نے اس کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

بہر صورت اردو کے مقتدر شعراء کے خطوط اور ان کے کلام جو اس دور میں ان کے ہمعصر شعرا اور اساتذہ شعرا نے سراہا اور تسلیم کیا ہے کہ ان کی شاعری پر پورا پورا داغؔ کا رنگ نمایاں ہے۔ساتھ ہی اپنی شاعری کی بدولت آج بھی انہیں فصیح الملک حضرت داغؔ دہلوی کا سچا جانشیں تسلیم کیا جانا چاہئے۔ان کا انتقال 1337ھ بمطابق 1919ء میں بعمر 45 سال ہوا۔ان کی رحلت کی تاریخیں ’گلدستہ جلوہ یار‘ میں کثرت سے شائع ہوئیں۔

حوالے

(۱) ذکر و مطالعہ — پروفیسر ذکی الحق
(۲) انشائے داغ — احسن مارہروی
(۳) بہار میں اردو شاعری کا ارتقا — کلیم احمد عاجزؔ
(۴) گل تر — نسیمؔ ہلسوی عظیم آبادی
(۵) موج نسیم — نسیمؔ ہلسوی عظیم آبادی

❖❖❖

Sultan Azad
Pannu Lane, Gulzarbagh
Patna - 800004 (Bihar)
Mob- 8789934730

محمد اویس سنبھلی

رقص جنوں اور گردش ایام کا شاعر:
ملک زادہ منظور احمد

چار حرفی لفظ ''پریس'' اپنے آپ میں بڑی وسعت اور ہمہ گیریت رکھتا ہے۔لفظ 'پریس' کے آتے ہی ذہن کے پردے پر الیکٹرانک میڈیا اور پرنٹ میڈیا کا تصور اُبھرتا ہے۔ دونوں شعبے اہم ہیں اور ان سے وابستہ افراد واشخاص کو صحافی، جرنلسٹ اور پترکار کہا جاتا ہے۔ اس کے بالکل برعکس پرنٹنگ پریس سے وابستہ افراد کو اتنا اہم یا قابل ذکر نہیں سمجھا جاتا، لیکن میری فکر بالکل مختلف ہے۔ پرنٹنگ پریس سے وابستگی انسان کو بالغ نظر بناتی ہے۔ پریس مالکان پر تجربات ومشاہدات کا نیا جہاں منکشف ہوتا ہے، جو ساری دنیا کے تجربات حاصل کر کے بھی ممکن نہیں۔ پرنٹنگ پریس کے ذریعہ ہر عمر اور رنگ ونسل کے افراد سے ملاقات ہوتی ہے۔ ادیبوں، شاعروں اور صحافیوں کا وہ طبقہ جو باپ اور دادا کی عمر کا ہے، اُن کے ساتھ بھی بار بار کا اُٹھنا بیٹھنا ہوتا ہے۔ ملاقات کا سلسلہ دراز ہوتا ہے تو تعلق قرب اور قرب دوستی میں تبدیل ہو جاتا ہے اور عمروں کے تفاوت کا احساس بھی رفتہ رفتہ مٹنے لگتا ہے۔ کچھ ایسی ہی پروفیسر ملک زادہ منظور احمد کی کہانی ہے۔ بزرگوں اور دوستوں سے اُن کے متعلق بہت کچھ سن رکھا تھا، بالخصوص ماموں جان محترم حفیظ نعمانی کے ذریعہ، مگر براہِ راست ملاقات کی سعادت نصیب نہ ہو سکی تھی، یہ سعادت نعمانی پرنٹنگ پریس کے ذریعہ ہی نصیب ہوئی۔ ادبی جریدہ ''امکان''، جس کے وہ مدیر اعلیٰ تھے، بغرض اشاعت نعمانی پریس آیا تو بہت سے راز

منکشف ہوئے۔ ہر ملاقات میں ایک پردا ہٹااور ایک حقیقت سامنے آئی۔ گوکہ یہ ملاقاتیں کم ہیں مگر ان ملاقاتوں نے پروفیسر ملک زادہ منظور احمد کے قد کو میری نظروں میں بہت بلند کر دیا۔ رسالہ کی ادارت سے اشاعت تک کے سارے مراحل میں وہ پیش پیش رہتے۔ پرنٹنگ پریس سے ڈاک خانے تک جملہ کام انجام دیتے۔ شکوہ نہ شکایت، کہیں کسی مشاعرے یا کانفرنس سے لفافہ ملا اور ''امکان'' کا تازہ شمارہ شائع ہوگیا۔ جب تک وہ حیات رہے، تبھی تک ''امکان'' حیات رہا۔ ملک زادہ جاوید اور پرویز ملک زادہ نے اس کی اشاعت کا بیڑہ اُٹھایا تھا اور 'امکان' کو ماہنامہ کے بجائے سہ ماہی کر دیا گیا تھا، لیکن اب 'امکان' کی اشاعت کے امکانات بھی معدوم ہیں۔

ملک زادہ صاحب بزرگ ضرور تھے مگر اُن کی فکر بوڑھی نہیں تھی۔ وہ علم وادب کا آسمان تھے مگر، زمین کی طرح ملتے تھے۔ مکر وریا سے کوسوں دور تھے۔ اس لئے ان کی رحلت سے نہ صرف ایک عہد، بلکہ ایک فن کا بھی خاتمہ ہوگیا اور ایسا خلا پیدا ہوا کہ بظاہر جس کے پُر ہونے کی کوئی سبیل نظر نہیں آتی۔ حفیظ نعمانی نے سچ ہی تو لکھا ہے:

> ''وہ مشاعروں کی نظامت کے موجد بھی تھے اور خاتم بھی——اب کوئی شاگرد بنے یا مرید، مگر حقیقت یہی ہے کہ یہ فن اُنھیں پر ختم ہوا۔''

مشاعرے جب سے ہوتے آئے ہیں، اُن میں نظامت بھی ہوتی ہی رہی ہے، لیکن شاید اردو مشاعروں کی پوری تاریخ میں ملک زادہ منظور احمد سے پہلے کسی نے نظامت کو وہ راہیں نہیں دکھائی تھیں، جو ملک زادہ صاحب نے دکھائیں، اسی کا نتیجہ تھا کہ مشاعروں میں کون کون شعراء آرہے ہیں، کے ساتھ یہ سوال بھی ہونے لگا کہ نظامت تو ملک زادہ صاحب ہی کررہے ہیں نا؟ انور جلال پوری ''روشنائی کے سفیر'' میں ملک زادہ منظور احمد کی نظامت کے تعلق سے لکھتے ہیں:

> ''مشاعروں سے ڈاکٹر صاحب کا تعلق وہی ہے جو تاج محل سے شاہجہاں کا، جس طرح یہ فیصلہ کرنا زیادہ مشکل ہے کہ تاج محل زیادہ خوبصورت ہے یا شاہجہاں کے ذہن کی تخئیل، اسی طرح یہ بھی فیصلہ کرنا

مشکل ہے کہ آزادی کے بعد ہمارے ملک میں مشاعرے زیادہ مقبول ہوئے
یا ملک زادہ منظور احمد کا انداز تعارف۔''

(روشنائی کے سفیر،ص:132)

نظامت کے حوالہ سے وہ اتنے معروف اور مشہور ہوئے کہ اُن کی شاعری پیچھے رہ گئی، وہ پوری دنیا میں مشاعروں میں بلائے جاتے، لیکن شاعر کی حیثیت سے کم اور ناظم مشاعرہ کی حیثیت سے زیادہ، آپ کہنے دیں تو میں کہوں کہ اُن کی نظامت نے ان کی شاعری پر بہت ستم ڈھایا، ورنہ وہ ایسے شاعر تھے کہ اگر وہ کامیاب ناظم مشاعرہ نہ بھی ہوتے تو بھی اُن کا تعارف ایک باکمال اور معتبر شاعر کی حیثیت سے ضرور ہوتا، اُن کی حیات میں ہی نہ جانے اُن کے کتنے اشعار تھے، جو زباں زد خاص وعام ہوگئے تھے، یہ مشہور اشعار بھی تو اُن ہی کے ہیں:

چہرے پہ سارے شہر کے گرد ملال ہے
جو دل کا حال ہے وہی دلّی کا حال ہے

....

میں ایک جام ہوں کس کس کے ہونٹ تک پہنچوں
غضب کی پیاس لیے ہر بشر لگے ہے مجھے

....

رسم تعظیم نہ رُسوا ہو جائے
اِتنا مت جھکئے کہ سجدہ ہو جائے

....

دیکھوگے تو ہر موڑ پر مل جائیں گی لاشیں
ڈھونڈوگے تو اس شہر میں قاتل نہ ملے گا

ملک زادہ منظور احمد کو شاعری اور نثر دونوں پر مکمل عبور حاصل تھا۔ وہ ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے، افسانہ ہو یا ناول، تنقید ہو یا تحقیق، غزل ہو یا نظم، ہر صنف میں اُنہوں نے اپنی جودت فکر کے جوہر دکھائے ہیں، وہ جن لفظیات کا استعمال اپنی تقریروں

میں کرتے تھے وہی لفظیات ان کی شاعری میں بھی دیکھی جاسکتی ہیں۔ وہ زبان وقلم دنوں کے دھنی تھے۔''شہرِ سخن''، ''شہرادب''، ''مولانا ابوالکلام آزاد:فکر وفن''،''غبارِ خاطر کا تنقیدی مطالعہ''،''مولانا ابوالکلام آزاد الہلال کے آئینے میں''،''اردو کا مسئلہ''،''کالج گرل''، مجموعہ غزلیات ''شہرِ ستم'' کےعلاوہ خودنوشت ''رقصِ شرر'' اور مشاعروں میں اُن کی نظامت اور اُن کا اندازِ تعارف ہمیشہ اُن کی یاددلاتے رہیں گے۔

فنا کے بعد بھی دنیا نہ بھولے گی تجھے روشن
ترا ذکر جنوں ہوتا رہے گا کو بہ کو برسوں

ڈاکٹر ملک زادہ منظور کا شعری سرمایہ''شہرِ ستم'' 35 /غزلوں اور گیارہ نظموں تک محدود ہے، جو یقیناً اُن کی شاعری کا ایک مختصر انتخاب ہے،لیکن اس میں کیفیت، خیالات، نظریات اور جذبات کا ایک ٹھاٹھیں مارتا سمندر ہے، مطالعہ سے محسوس ہوتا ہے گویا دریا کو کوزہ میں سمو دیا گیا ہے، بقول پروفیسر احمد محفوظ:

> ''ان کے کلام کے قابل توجہ قرار پانے میں کمیت سے زیادہ اس کی کیفیت کو دخل ہے، یعنی یہ کلام اگرچہ بہت زیادہ نہیں ہے، لیکن جتنا کچھ بھی ہے، وہ ایسے طرز کا حامل ہے، جسے اپنے مخصوص پس منظر میں کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔''

(ملک زادہ منظور احمد شخصیت اور فن، مرتبہ حکیم نازش احتشام اعظمی ص:106)

ملک زادہ منظور احمد کی شاعری مشاعرے میں پیش کی جانے والی شاعری سے خاصی بلند ہے، اور ایسا اس لیے ہے کہ اُنھوں نے کلاسیکی شعری روایت سے فیض حاصل کرنے کے سبب اپنی شاعری کو مروّج چکا چوند سے دور رکھا، اُنھوں نے غزلیں بھی کہی ہیں اور نظمیں بھی اور اُن کی نظم کا آہنگ غزل کے لہجے اور تیور سے خاصا قریب نظر آتا ہے۔ پروفیسر ظفر احمد صدیقی لکھتے ہیں:

> ''وہ اصلاً غزل کی روایت کے امین ہیں، اُن کی تربیت اور مزاج کلاسیکی ہے، لیکن اُن کی شاعری کی داخلی فضا عصری حسیت سے معمور

ہے۔“

(ایضاً ص:27)

پروفیسر ملک زادہ منظور کی شخصیت اور شاعری دونوں سادگی، جامعیت اور قطعیت کی عمدہ مثال ہیں، غیرت مندی، خودداری اور انسان دوستی اُن کی فطرت میں شامل تھی، اُنہوں نے انگریزوں کے مظالم، جنگ آزادی، تقسیم ہند کے بعد کی زبوں حالی اور انسانی قدروں کی پامالی کا بچشم خود مشاہدہ کیا، اور پاش پاش ہوتی انسانیت، ظلم و جبر، ناانصافی کے خلاف اپنی شاعری اور اپنے عمل سے احتجاجی آواز بلند کی، اُنہوں نے زندگی کے حقائق اور اسرار کو بڑے لطیف انداز میں اپنے کلام کے ذریعہ پیش کیا ہے، بقول ڈاکٹر تابش مہدی:

ملک زادہ شاعری میں اس رویہ کے حامی تھے، جو اسے سماج اور معاشرے سے جوڑتا ہے——اس کے ساتھ ساتھ وہ اس کی فنی بالاتری کے بھی قائل تھے۔ (ایضاً ص:59)

اُن کی شاعری میں حسن و عشق کی فضا، غم جاناں کے ساتھ ساتھ غم دوراں کا بیان، دوسروں کے غم کو اپنا بنالینے کا احساس، فسادات اور دنگوں کی تصویر، موت وحیات کی کشمکش وانسانیت نوازی کا ذکر بھی ہے اور فکر ونظریہ کی بلندی بھی، چند اشعار بطور مثال پیش ہیں، ملاحظہ کیجئے:

عجب درد کا رشتہ ہے ساری دنیا میں
کہیں ہو جلتا مکاں اپنا گھر لگے ہے مجھے

....

کچھ غم جاناں کچھ غم دوراں دونوں میری ذات کے اندر
ایک غزل منسوب ہے مجھ سے ایک غزل حالات کے نام

....

بستی بستی ظلم فراواں کل بھی تھا اور آج بھی ہے
امن وسکون اِک خواب پریشاں کل بھی تھا اور آج بھی ہے

....

آوارگی کا حق ہے ہواؤں کو شہر میں
گھر سے چراغ لے کے نکلنا محال ہے

....

گرتے خیمے، جلتی طنابیں، آگ کا دریا، خون کی نہر
ایسے منظّم منصوبوں کو، دوں کیسے آفات کا نام

....

قد و گیسو سے اُٹھا دار ورسن کا فتنہ
غم جاناں نے سکھائے غم دوراں کے چلن

ملک زادہ منظوراحمد کی غزل میں گل وبلبل کے مضامین نمایاں حیثیت نہیں رکھتے بلکہ روایتی انداز میں ضمنی طور پر ان کا ذکر ہوتا ہے، اصل مقصود سماج کے مختلف مسائل اور ناپید ہورہی تہذیب اور اقدار کو موضوع بنانا ہوتا ہے، ان کی شاعری کو ہم حالات کا گریہ اور مرثیہ کہہ سکتے ہیں بلکہ پروفیسر ملک زادہ نے خود اپنی غزل کو حالات کے مرثیہ سے تعبیر کیا ہے۔ پروفیسر احمد محفوظ ملک زادہ کی شاعری سے متعلق تحریر کرتے ہیں:

> ''جہاں تک ملک زادہ کے کلام کی فکری جہت کا تعلق ہے تو اتنی بات تو پوری طرح عیاں ہے کہ ان کی غزلوں کے مضامین زیادہ تر روایتی عشقیہ انداز کے ہیں، لیکن ان میں متکلم یا شاعر جدید عہد کے فرد کی حیثیت سے زیادہ نمایاں ہے۔''

(ایضاً ص:111)

ملک زادہ منظوراحمد کی غزلوں سے منتخب اشعار ملاحظہ کریں:

پڑھ چکا اپنی غزل منظوؔر تو ایسا لگا
مرثیہ تھا دور حاضر کا غزل خوانی نہ تھی

....

گر کبھی جانب میخانہ گئے میرے قدم
تلخیٔ زیست بھی شامل رہی پیمانے میں

....

سب نے سنی ہے جس میں عصرِ رواں کی دھڑکن
منظور ہم نے ایسا سازِ غزل دیا ہے

البتہ اس سے بھی انکار یا صرفِ نظر نہیں کیا جاسکتا کہ حسن و عشق سے معمور فضا بھی ان کی شاعری کا اہم حصہ ہے۔

پسِ نقاب ضیائے بدن کی بات کرو
اسیرِ شب کسی صبحِ چمن کی بات کرو

....

ترکِ محبت اپنی خطا ہو ایسا بھی ہوسکتا ہے
وہ اب بھی پابندِ وفا ہو ایسا بھی ہوسکتا ہے

....

دروازے پر آہٹ سن کر اس کی طرف کیوں دھیان گیا
آنے والی صرف ہوا ہو ایسا بھی ہو سکتا ہے

....

حسن کو موردِ الزام نہیں ٹھہرایا
اپنے ہی عشق پہ الزام دھرے ہیں میں نے

عصری صداقتوں کا اظہار ملک زادہ منظور احمد کی شاعری کا خاص موضوع ہے، ان کے یہاں کسی کا خوف نہیں ہے، وہ جو بات کہتے ہیں دوٹوک لہجے میں کہتے ہیں، سچ بات کہنے میں وہ ہچکچاتے نہیں اور جرأت مندانہ انداز میں اپنی بات رکھتے ہیں، جس میں ایک دلیری اور حالات سے مردانہ وار مقابلہ کی کیفیت ملتی ہے، ترشی اور تلخی ان کی شاعری میں واضح محسوس کی جاسکتی ہے، وہ ایسے الفاظ کا انتخاب کرتے ہیں جو اپنی تمام تر معنی خیزی، آہ اور واہ کی ملی جلی

کیفیت کے ساتھ سیدھے قاری کے دل میں جاگزیں ہوجاتا ہے، اجنبی تشبیہات اور استعارات کے غیر ضروری استعمال سے اجتناب کرتے ہیں،خواہ حالات کتنے ہی مخالف اور دردوالم سے گھرے ہوئے ہوں، وہ زندگی کو ہر حال میں جئے جانے کا حوصلہ رکھتے ہیں، کسی کے آگے دست سوال دراز کرنا پسندنہیں کرتے قناعت،صبر اور اپنی چادر دیکھ کر پیر پھیلانا ان کا شیوہ ہےاور طرز حیات بھی، مصیبتوں اور آلام زندگی سے گھبراتے نہیں ہیں، بلکہ تلخ حقائق کے بے باکانہ اظہار ان کے کلام میں انفرادیت پیدا کرتا ہے، سردار علی جعفری ''شہر ستم'' کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

''ان کے سارے الفاظ اور استعارے جانے پہچانے ہیں، لیکن ان کے استعمال میں ایک ندرت اور تازگی ہے، خوف جو آج کی شاعری کا ایک اہم موضوع بن گیا ہے، ملک زادہ کے اشعار میں بھی جھلکتا ہے لیکن ان کو پڑھ کر دل پر خوف طاری نہیں ہوتا بلکہ ایک لطیف احساس بن جاتا ہے، یہ ان کے کلاسیکی ریاض کا اثر ہے اور غالب کی عطا کی ہوئی میراث ہے۔''

(شہر ستم، ملک زادہ منظور ص:7)

درج ذیل چند اشعار پروفیسر ملک زادہ منظور احمد کی شاعری کے مضامین کو سمجھنے میں بہتر طور پر ہماری مدد کرتے ہیں:

ہر قدم مرحلۂ مرگ تمنا ہے مگر
زندگی پھر بھی ترا ساتھ نہ چھوڑا جائے

....

وقت شاہد ہے کہ ہر دور میں عیسیٰ کی طرح
ہم صلیبوں پہ لئے اپنی صداقت آئے

....

نہ خوف برق نہ خوف شرر لگے ہے مجھے
خود اپنے باغ کے پھولوں سے ڈر لگے ہے مجھے

....

جو بات کہی جائے تیور سے کہی جائے
جو شعر کہا جائے حریفانہ کہا جائے

....

غم جاناں جو نہیں ہے، غم دوراں ہے بہت
زندگی تیرا ہر اک رنگ میں احساں ہے بہت

....

گر کبھی میں نے جلائی ہے یقیں کی قندیل
نار نمرود میں بھی پھول کھلائے میں نے

....

میکدہ کا اسی ساقی سے بھرم ہے منظور
تشنہ لب رہ کے جو اوروں کو پلا دیتا ہے

....

منظورؔ کا یہ ظرف کہ کچھ مانگتا نہیں
مرضی تری، جو چاہے اسے ذوالجلال دے

پروفیسر ملک زادہ منظور احمد کا کلام گرچہ اُن کی ہمہ جہت شخصیت اور متحرک زندگی کے مقابل بہت کم ہے، لیکن اُنہوں نے جس طرح سے اپنے تجربات واحساسات اور ٹھوس حقائق کو فنی التزام کے ساتھ شعری پیکر میں ڈھالا ہے، اس نے کلام میں ایک کسک یا سرور کی کیفیت پیدا کردی ہے اور جو کچھ ہے وہ سراپا انتخاب ہے، جو ہمیشہ ہمیں ان کی یاد دلاتا رہے گا۔

❖❖❖

Mohd Ovais Sambhli
178/157, Barood Khana,
Near Lal Masjid, Golaganj,
Lucknow - 226018 (U.P.) INDIA
Mobile: 7905636448

کہکشاں عرفان

ارشد منیم کی افسانہ نگاری کا تجزیاتی مطالعہ

کسی بھی تخلیق کار کی تخلیق پر تنقیدی تحریر لکھتے وقت سب سے پہلے ناقد کے ذہن میں پہلا سوال یہ آتا ہے کہ یہ تحریر ہم کس کے لئے لکھ رہے ہیں؟ تخلیق کار کے لئے؟ قارئین کے لئے؟ یا ہر طالب علم کے لئے؟ اگر ہم تخلیق کار کے لکھتے ہیں تو یقیناً اس تحریر میں تعریف زیادہ ہوگی اور تخلیق کار کی خوشنودی کے لئے لکھی گئی ایسی تحریر طالب علموں کو فیض نہیں پہنچا سکتی۔اور یہ تحریر تاثراتی تنقید کے زمرے میں آتی ہے جس میں ناقد تخلیق کار اور اس کی تخلیقات سے بے پناہ متاثر ہوتا ہے۔اگر ہم قارئین کے لئے لکھ رہے ہیں تو تخلیق کار کا تعارف ضرور کرانا چاہئے تا کہ قارئین کو تخلیق کار کے بارے میں اہم معلومات حاصل ہوسکیں،اگر ہم طالب علموں کو بھی ذہن رکھ کر مقالہ تحریر کریں یا تنقید کریں تو تنقید کے اصول اور معیار کو ذہن میں رکھتے ہوے مدلل تنقیدی تحریر پیش کی جائے تو طالب علموں کے لئے تحریر مفید ثابت ہوگی۔کسی بھی افسانہ نگار کی افسانہ نگاری پر بات کی جائے تو افسانہ نگار کا تعارف،اس کا پس منظر،اس کے تخلیقی محرکات اور اس کی ادبی سرزمین پر بھی نگاہ ہونی چاہئے۔افسانہ کسے کہتے ہیں؟ افسانہ کے اجزائے ترکیبی اور افسانے کی فنی خصوصیات کی بنا پر افسانوں کا تجزیہ کیا جاے تو افسانہ نگار کے ساتھ انصاف کیا جا سکے گا اور طالب علموں کی تشنگی مٹائی جا سکے گی تا کہ آنے والی نسلیں بھی فن پارے پر تنقیدی مضامین یا مقالہ تحریر کرتے وقت ان اصول وضوابط اور نظریات کو مدنظر رکھیں۔

ارشد منیم کا مختصر طور پر تعارف کرایا جائے تو سب سے پہلے ان کا تعارف ان کے وطن،

ان کی ادبی سرزمین کا ہوگا جسے پنج آب کہتے ہیں۔پنج آب پانچ ندیوں سندھ، راوی، چناب، ستلج، جہلم سے مل کر بنا یہ صوبہ اپنی زرخیزی، زراعت اور محنت کشی کے لئے مشہور ہے

"کسی بھی افسانہ نگار کی افسانہ نگاری پر بات کی جائے تو افسانہ نگار کا تعارف، اس کا پس منظر، اس کے تخلیقی محرکات اور اس کی ادبی سرزمین پر بھی نگاہ ہونی چاہیے۔افسانہ کسے کہتے ہیں؟ افسانہ کے اجزائے ترکیبی اور افسانے کی فنی خصوصیات کی بنا پر افسانوں کا تجزیہ کیا جائے تو افسانہ نگار کے ساتھ انصاف کیا جا سکے گا اور طالب علموں کی تشنگی مٹائی جا سکے گی تا کہ آنے والی نسلیں بھی فن پارے پر تنقیدی مضامین یا مقالہ تحریر کرتے وقت ان اصول وضوابط اور نظریات کو مدنظر رکھیں۔"

ہی، یہ صوبہ اردو زبان و ادب کے لئے بھی بہت مردم خیز ثابت ہوا ہے۔پنجاب کی مٹی سے اردو ادب کی بہت ساری مایہ ناز شخصیات پیدا ہوئی ہیں اور ان شخصیتوں نے اپنی فن کاری، اپنی تخلیقیت اور اردو زبان وادب سے بے پناہ محبت کے باعث اردو زبان و ادب کے چمن کو صرف سرسبز وشاداب ہی نہیں ثمر بار بھی کیا ہے۔اردو زبان کی تحقیق کا ذکر ہو تو سرزمین پنجاب کے محقق ڈاکٹر محمود شیرانی کی تحقیق کے بغیر ادھورا ہوگا۔شاعری کی بات کی جائے تو ساحرلدھیانوی کی سحر انگیز اور دلکش شاعری کو کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا ہے۔افسانہ نگاری کے افق کی طرف نظر دوڑائیں تو افسانے کے افق پر کئی تابناک ستارے نظر آتے ہیں۔کرشن چندر طلسم خیال میں کھویا ہوا، مہالکشمی کے پل کے نیچے، دادر پل کے بچوں کے ساتھ کھڑا ہوکر کسی ان داتا کا انتظار کرتا نظر آتا ہے۔صرف کرشن چندر ہی کیوں؟ راجندر سنگھ بیدی بھی تو بھولا کے ساتھ گرم کوٹ پہنے لاجونتی سے کہہ رہا ہے اپنے دکھ مجھے دیدو کہتے ہوئے افق ادب پر ایک منفرد شناخت کے ساتھ نظر آتا ہے، جس کا دھیما لہجہ روسی ادیب چیخوف سے مماثلت رکھتا ہے جو گھریلو زندگی کے چھوٹے چھوٹے واقعات واحساسات اور مسائل کو بڑی خوبی سے افسانہ

بنا دیتا ہے۔سعادت حسن منٹو جس کا تعلق تو کشمیر کی منٹو برادری سے ہے مگر وہ کشمیری منٹو بھی رسالہ ضلع لدھیانہ پنجاب میں ہی پیدا ہوا اور امرتسر میں تعلیم حاصل کی۔اس لئے منٹو کی ادبی سرزمین بھی پنجاب ہی ہے۔منٹو، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، احمد ندیم قاسمی یہ لوگ ہم عمر، ہم عصر ہونے کے ساتھ ہم وطن بھی تھے۔اس صورتحال میں اپنی منفرد پہچان بنانا بہت مشکل امر ہوتا ہے۔منٹو نے اپنی افسانہ نگاری سے معاشرے میں پھیلی بدبودار جنسی کج روی سے قارئین کو روشناس کرایا،منٹو کے افسانوں میں ٹھنڈا گوشت، کالی شلوار، موذیل، ہتک، میرا نام رادھا ہے، نیا قانون اور ٹوبہ ٹیک سنگھ کو کون بھلا سکتا ہے؟ احمد ندیم قاسمی نے پنجاب کی دیہی زندگی کے کرداروں اور دیہاتوں کی ریت رواج رہن سہن، احساسات وجذبات کو بڑی فنی مشاقی کے ساتھ چوپال، بگولے، آبلے، آنچل، درودیوار اور بازار میں پیش کیا ہے۔ بلونت سنگھ پنجاب کی زندگی کا نبض شناس اور فن افسانہ نویسی کا ماہر بھی، جس کا سنہرا دیش بھلایا نہیں جا سکتا اور ان کے مشہور ومعروف کردار جگا کو فراموش کیا جا سکتا ہے کیا؟ ان افسانہ نگاروں کے علاوہ بھی پنجاب کے افسانہ نگاروں کی ایک طویل فہرست ہے جیسے امرتا پریتم، مہندر ناتھ سنگھ، کرتار سنگھ دگل، سریش کمار نے بھی اردو ادب کے خزانے کو معمور کیا ہے۔عصر حاضر یا معاصر ادیب وادب کی بات کی جائے تو بشیر مالیرکوٹلوی، ڈاکٹر کیول دھیر، کرشن بیتاب، رینو بہل، ارشد منیم اور ناصر آزاد وغیرہ نے اردو زبان وادب کو نہ صرف زندہ رکھا ہے بلکہ اردو زبان وادب سے بے پناہ محبت کی ہے اور اپنی تخلیقات سے اردو ادب کے گلشن کو گل و گلزار کیا ہے۔سرزمین پنجاب کا ایک شہر یا قصبہ جو اردو ادب اور بالخصوص افسانہ نویسی میں اپنی شناخت قائم کر چکا ہے اس قصبے کا نام مالیرکوٹلہ ہے۔مالیرکوٹلہ کی سرزمین بڑی مردم خیز زمین ثابت ہوئی۔شاعری میں ڈاکٹر روبینہ شبنم ہیں تو افسانہ نگاری میں بشیر مالیرکوٹلوی نے مالیرکوٹلہ کو ادبی شناخت بخشی ہے جسے اردو ادب کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔بشیر مالیرکوٹلوی نے اردو ادب کو سات افسانوی مجموعوں سے نوازا ہے۔ان کے افسانوں میں احتجاج کا رنگ غالب ہے۔ریمیکس افسانہ نگاری میں بھی سب سے زیادہ افسانے بشیر مالیرکوٹلوی نے تحریر کئے ہیں۔مجموعی طور پر بشیر مالیرکوٹلوی بارہ سے زائد تصنیفات کے خالق ہیں جس میں

تنقید،تحقیق، افسانہ،ناول سبھی شامل ہیں مگر ان کی سب سے بہترین تخلیقات ان کے شاگردان ہیں،جن میں ارشدمنیم اور ناصر آزاد کا نام سرفہرست ہے۔ان دونوں شاگردوں نے اپنے ادبی استاد بشیر مالیرکوٹلوی کی افسانہ نویسی اور افسانچہ نویسی کی وراثت کی نہ صرف حفاظت کی ہے بلکہ اس وراثت کو اپنی تخلیقی صلاحیتوں سے آگے بڑھایا ہے۔

> ''ارشدمنیم کا تعلق بھی پنجاب کے مالیر کوٹلہ سے ہے اور اس افسانہ نگار کی شخصیت سازی میں بشیر مالیرکوٹلوی کا بہت اہم کردار ہے۔ارشدمنیم با قاعدہ طور پر ادب کے طالب علم نہیں رہے۔انہوں نے ہماری اور آپ کی طرح اعلیٰ تعلیم کی ڈگریاں بھی نہیں حاصل کی ہیں۔وہ محض بارہویں جماعت پاس ہیں۔ان کو اپنے والدین سے بھی کوئی ادبی ماحول یا ورثہ نہیں ملا ہے۔ارشد منیم اردو ادب کے مطالعہ اور حصول تعلیم اور اپنے ادبی ذوق و شوق کی وجہ سے افسانہ نویسی کی طرف راغب نہیں ہوئے بلکہ یہ افسانہ نگار بے لوث محبّ اردو زبان و ادب بشیر مالیرکوٹلوی کی تربیت سازی اور شخصیت سازی کا تخلیقی ثمر ہے۔''

ارشدمنیم کا تعلق بھی پنجاب کے مالیرکوٹلہ سے ہے اور اس افسانہ نگار کی شخصیت سازی میں بشیر مالیرکوٹلوی کا بہت اہم کردار ہے۔ارشد منیم با قاعدہ طور پر ادب کے طالب علم نہیں رہے۔انہوں نے ہماری اور آپ کی طرح اعلیٰ تعلیم کی ڈگریاں بھی نہیں حاصل کی ہیں۔وہ محض بارہویں جماعت پاس ہیں۔ان کو اپنے والدین سے بھی کوئی ادبی ماحول یا ورثہ نہیں ملا ہے۔ارشدمنیم اردوادب کے مطالعہ اور حصول تعلیم اور اپنے ادبی ذوق وشوق کی وجہ سے افسانہ نویسی کی طرف راغب نہیں ہوئے بلکہ یہ افسانہ نگار بے لوث محبّ اردوزبان و ادب بشیر مالیرکوٹلوی کی تربیت سازی اور شخصیت سازی کا تخلیقی ثمر ہے۔اکیسویں صدی کے

نوجوان افسانہ نگار ارشدؔ منیم بشیر مالیرکوٹلوی کی ادبی انجمن کا وہ حساس افسانہ نگار ہے جس نے بہت کم وقت میں افسانہ نگاری کی فکر اور فن دونوں کے معیار پر کھرے اترنے والے دل و دماغ، اور روح کو جھنجوڑنے والے افسانے تخلیق کئے ہیں۔ ارشدؔ منیم پیروں سے معذور ہیں مگر وہ بہت متحرک و فعال، زندہ دل، باضمیر، باکردار اور حساس انسان ہیں۔ ان کے پاس ڈگریوں کی کمی ضرور ہے مگر ان کی نگاہیں عقابی اور ان کا مشاہدہ بہت گہرا ہے۔ ان کی حساسیت معاشرے کے ہر شعبۂ حیات کے افراد خواہ وہ مرد ہو یا عورت، استاد ہو طالب علم، والدین ہوں یا بچے، شوہر ہو یا بیوی، ڈاکٹر ہو یا مریض، مزدور ہو یونین لیڈر، شرفاء ہوں یا بدنام گلیوں کی طوائفیں، دوست ہوں یا دشمن، نکاح، طلاق، یا پھر حلالہ، میکہ ہو یا سسرال، مولوی ہو یا پنڈت، پرنٹ میڈیا ہو یا الیکٹرانک میڈیا، ادب ہو یا سیاست، تعلیم گاہ ہو یا گھر کی چہار دیواری، سیاسی، معاشرتی اور خانگی زندگی کے ہر مسئلہ پر ارشدؔ منیم کی نظر ہے۔ ارشد منیم اکیسویں صدی کے نوجوان افسانہ نگار ہیں۔ ارشدؔ منیم کے افسانے ہند و پاک کے مؤقر رسائل میں شائع ہوکر شرف قبولیت حاصل کر چکے ہیں۔

ارشد کی ادبی زندگی کا آغاز سن 2000 سے ہوتا ہے۔ ان کی افسانہ نویسی کا سفر دو دہائیوں پر مشتمل ہے۔ ان کا پہلا افسانوی مجموعہ "خواب خواب زندگی "2015 میں شائع ہوکر منظر عام پر آیا۔ دوسرا مجموعہ "خون کا رنگ" بھی 2018 میں شائع ہوکر مقبولیت حاصل کر چکا ہے۔ تیسرا مجموعہ "لاوا" بھی 2021 میں اشاعت پذیر ہوکر قارئین کے ہاتھوں اور نگاہوں تک رسائی حاصل کر چکا ہے۔

ارشدؔ منیم کی افسانہ نگاری میں معاشرے کے متوسط اور غریب طبقہ کے رہن سہن، ان کی پریشانیاں، زندگی کی دھوپ چھاؤں، سماج کے مسائل، جرائم، کردار و اخلاق کا زوال، انسانی نفسیات، نفسانی خواہشات، غربت کی مشکلات سے جوجھتے انسان اور رشتوں کے ٹوٹنے بکھرنے کی جو چبھن ہے اس سے ہونے والی تکالیف کے احساسات کو بہت سہل انداز میں پیش کرنے کا ہنر بھی ہے۔ ارشدؔ منیم کے افسانوں میں احتجاج کی گونج کئی بار سنائی دیتی ہے۔ ان کے کردار ان کے ارد گرد کے متوسط طبقہ کے عام انسان ہیں، اکثر و بیشتر ان کے

کردار غیر مسلم ہوا کرتے ہیں اور زبان کی بات کریں تو سیدھی سادھی گھریلو اور عام بول چال کی زبان استعمال کرتے ہیں۔ سب سے پہلے ارشد منیم کے پہلے مجموعہ ''خواب خواب زندگی'' کی بات کرتے ہیں۔ اس مجموعہ میں کل سترہ افسانے اور آٹھ افسانچے شامل ہیں۔ پہلا افسانہ ہی ٹائٹل افسانہ ہے۔ خواب خواب زندگی غریبوں، مزدوروں، محنت کشوں، مجبوروں کے خوابوں کی کہانی ہے، جن کی پوری زندگی دال روٹی کا انتظام کرنے میں گزر جاتی ہے۔ جو کھلی آنکھوں سے بہتر زندگی اور مستقبل کے سہانے خواب دیکھتے ہیں۔ کوئی اپنے خستہ حال جھونپڑے کی مرمت اور پختہ کرانے کے خواب دیکھتا ہے۔ کوئی بیٹی کی شادی اور رخصتی کے، کوئی روزگار کے، کوئی بچوں کی تعلیم اور بہتر مستقبل کے، مگر غریبوں کے خواب بھی غریبوں کی طرح ارزاں اور بے وقعت ہوئے ہیں۔ ان کے خوابوں کو کبھی موسم توڑ دیتا ہے کبھی کوئی حادثہ، کبھی کوئی دوست، کبھی اولاد خوابوں کو کچل دیتی ہے۔ کبھی کوئی رہنما، یونین لیڈر یا عوام کا مقبول مسیحا ان کے خوابوں کی قبروں پر اپنا محل تعمیر کر لیتا ہے۔ یہ دکھ اور حسرت ہر غریب کا نصیب بن گیا ہے۔ غریب دنیا کی جس زمین یا ملک میں بھی رہتا ہو یا ملک کے جس خطے میں رہتا ہو موسم کی مار اس پر ہی پڑتی ہے۔ موسم سرما ہو یا موسم برسات غریبوں کے لئے پریشانی کا باعث ہی ہوتا ہے۔ پریم چند کی ایک مشہور زمانہ کہانی جو انگریزی میں The winter night, اور ہندی میں پوس کی رات کے عنوان سے مشہور ہے، جس کا پلاٹ امیری اور غریبی کی کشمکش، ضروریات پوری کرنے کی حسرتیں، پوس یعنی جاڑے کی کڑکڑاتی سردی، ساہوکار کی دھونس اور دھمکیاں، گالیاں، ہلکو کے کھیت میں کھڑی فصل سے قرض چکانے اور ایک کمبل خریدنے کا جو ادھورا خواب ہے، وہ صرف ہلکو اور اس کی بیوی کا نہیں ہے بلکہ ہر غریب، مزدور، کسان کا ہے۔ ہلکو کے سارے خواب آگ کے الاؤ کی گرمی میں جل کر خاک ہو گئے۔ ہلکو کی فصل نیل گاؤں کی خوراک بن گئی۔ پوس کی ٹھنڈی رات فصل کی حفاظت کے آڑے آ گئی۔ ہلکو سردی کے وجہ سے فصل کی رکھوالی نہ کر سکا، فصل برباد ہوئی تو قرض چکانے کا خواب، کمبل خریدنے کا سپنا ادھورا رہ گیا۔ پریم چند کی یہ کہانی قاری کے ذہن پر گہرا نقش چھوڑ جاتی ہے۔ اسی طرح ارشد منیم کی کہانی خواب خواب زندگی جس کا آغاز موسم

برسات کی ستم ظریفی سے ہوتا ہے۔ دولت منداور خوشحال طبقے کیلئے بارش مسرت وشادمانی کا باعث بنتی ہے اور غریبوں کے یہاں بارش پریشانیوں کو مزید بڑھا دیتی ہے۔ اس افسانے میں ہریا نامی کردار ہے جس کا مکان نہایت خستہ ہے۔ گھر کی چھت چھلنی کی طرح ہوگئی ہے جس کے باعث بارش کا پانی ہر طرف سے ٹپک رہا ہے اور ہریا کی بیوی منی اس پریشانی سے نبرد آزما ہے۔ منی جگہ جگہ گھر کے چھوٹے بڑے تمام برتنوں کو جگہ جگہ رکھ دیتی ہے تاکہ چھت سے ٹپک رہا پانی کچی زمین پر گر کر کیچڑ میں تبدیل نہ ہو جائے۔ ان کے دو معصوم بچے بھی غربت میں اپنے والدین کے ساتھ ان کی پریشانی میں شریک ہیں۔ اس افسانے میں ہریا اور منی کی مدد سے دنیا کے ان تمام غریبوں کی رہنمائی کی گئی ہے جو ہر وقت ہر لمحہ مشکلات سے جوجھتے رہتے ہیں۔ پھر چاہے وہ پریم چند کا ہلکو ہو یا ارشد منیم کا ہریا۔ ہلکو نے بھی جاگتی آنکھوں سے خواب دیکھے تھے مگر موسم سرما کی ہڈیوں کو کپکپاتی سردی کی طویل رات کا مقابلہ ہلکو نہیں کرسکا۔ خواب خواب زندگی کے ہریا کی آنکھوں نے بھی خواب دیکھے تھے۔ مزدوروں کو اپنے یونین لیڈر پر بہت بھروسہ تھا کہ بنسی جب ایم ایل اے بن جائے گا تو غریبوں کے دکھ دور ہو جائیں گے۔ ہریا کی چھت بن جائے گی، اس کے دونوں بچے اچھے اسکول میں تعلیم حاصل کریں گے، تعلیم یافتہ مگر بے روزگار آدرش کو ملازمت مل جائے گی، خواب خواب زندگی کا پلاٹ بہت مضبوط اور مربوط ہے اس کے تمام کردار معاشرے کے مانوس زندہ چلتے پھرتے، جیتے جاگتے، زندگی کے مسائل سے جوجھتے عام انسان ہیں۔ اس افسانے میں جزئیات نگاری اور منظر نگاری بہت خوب ہے۔ یہ افسانہ حقیقت کی تلخی میں ڈوبا ہوا ہے۔ ہریا اس کہانی کا مرکزی کردار ہے جو اپنے دوست آلوک کو تسلی دیتا ہے کہ بنسی اگر ایم ایل اے کا الیکشن جیت جائے گا تو ہم سب کے دلدر دور ہو جائیں گے۔ آلوک کی بیٹی کی شادی بھی پورے رسم ورواج اور دھوم دھام سے ہو۔ جائے گی۔ ٹوٹی ہوئی سڑک بھی سدھر جائے گی مگر ان سب کے خوابوں کو بنسی نے اپنی خود غرضی سے چکنا چور کر دیا۔ بنسی سابق ایم ایل اے سے تین لاکھ روپئے لیکر اپنی دعوے داری سے پیچھے ہٹ گیا۔ بنسی نے صرف اپنا الو سیدھا کیا اور ہریا، منی، آدرش، آلوک سب کے خوابوں کو کچل دیا۔

ارشد کے افسانوں میں کرداروں کی مناسبت سے ہی زبان اور تلفظ کا استعمال ہوا ہے،جس سے افسانہ فطری پن اور حقیقت نگاری سے ہم آہنگ ہوتا ہے۔ارشد منیم کے افسانوں میں پنجاب ہی نہیں پورا ہندوستان سانس لیتا نظر آتا ہے۔غربت، بے روزگاری، سیاسی داؤں پیچ، بدکرداریاں، بدعنوانیاں، دوغلا پن، شرافت کے پس پردہ شرافت کی دھجیاں بکھیرتا ہوا سماج، خواتین پر تشدد، دوسری شادی کی دھمکیاں، طلاق، حلالہ کا شرعی مگر ناپسندیدہ عمل، رات کے اندھیرے میں روشن ہونے والے کوٹھے، تاریکی کا فائدہ اٹھاتے سماج کے شریف اور بارسوخ لوگ ان کی نفسانی خواہشات اور زنا کا نتیجہ کوٹھے پر جنم لینے والے وہ معصوم بچے جن کے خون کا رنگ بھی سرخ ہوتا ہے مگر وہ بچہ کس شریف کی اولاد ہے؟ خان کا بچہ ہے یا ٹھاکر کی اولاد،مسلمان کا نطفہ ہے یا ہندو کا،اس کی شناخت کون کرے گا؟ کتنی عجیب بات ہے کہ معاشرے میں شرافت کی چادر اوڑھے ہوئے اعلی خاندان اور اونچی ذات اور مذہب کا ڈھنڈھورا پیٹنے والے لوگ کوٹھوں پر جا کر جنسی خواہشات کے آگے سب بھول جاتے ہیں اور چند روپیوں میں اپنی شرافت کا سودا کر آتے ہیں۔اپنی نسلوں کو در در کی ٹھوکریں کھانے کے لئے غلاظت کے گڑھے اور گناہوں کی دلدل میں چھوڑ آتے ہیں۔اس سلگتے ہوئے مسئلہ کو ارشد منیم نے اپنے افسانہ 'خون کا رنگ' میں بڑی مشاقی اور فن کاری کے ساتھ پیش کیا ہے۔اس افسانہ میں ارشد منیم کی فن کاری بہت پختہ نظر آتی ہے۔

افسانے کے اجزائے ترکیبی کی بات کی جائے تو پلاٹ، کردار، زبان و بیان، نقطۂ نظر، ماحول، فضا یا منظر نگاری، جزئیات نگاری اور وحدت تاثر آغاز و انجام ان سب کا ہونا افسانے میں ضروری ہوتا ہے۔مختصر افسانے کی عمر بہت کم ہے۔اس کا آغاز بیسویں صدی کے آغاز سے ہوتا ہے اور اردو کے اولین افسانہ نگاروں میں سب سے اہم نام منشی پریم چند کا ہے۔انہوں نے سماجی مسائل کو اپنی کہانیوں کا موضوع بنایا،معاشرتی آزادی،سماجی انصاف، وطن کی محبت اور روایات کی پاسداری، بزرگوں سے محبت ان کا احترام، خواتین کی عزت اور ان کی حصہ داری، معاشرے میں پھیلی بے حسی، غریبوں کی بے بس اور لاچار زندگی، ان کی چھوٹی چھوٹی ضروریات اور ارمانوں اور ان کے خوابوں کو اپنے افسانوں میں

جگہ دی ہے۔ جیسے عید گاہ، بڑے گھر کی بیٹی، پوس کی رات، منتر، دو بیل، زیور کا ڈبہ، کفن، بوڑھی کا کی وغیرہ میں ان تمام نکات کو دیکھا جا سکتا ہے۔ انھوں نے دیہی زندگی کی سچی تصویر کشی کی اور اپنے سادہ اسلوب اور سیدھی زبان کے ساتھ افسانوں کو فن کی بلندی پر پہنچایا۔ ان کے کردار اصلی اور فطری ہوا کرتے تھے اور ان کے کردار زندگی میں جا بجا نظر آتے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کرداروں سے ہم سب ملتے رہتے ہیں۔ ان باتوں کی روشنی میں اگر آج کے یعنی اکیسویں صدی کے نوجوان افسانہ نگار ارشد منیم کے افسانوں کا مطالعہ کیا جائے تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ ان کے افسانوں کے پلاٹ بہت منظّم اور اسلوب بہت سادہ ہوتا ہے۔ عام بول چال کی گھریلو سیدھی سادی زبان ہوتی ہے، آس پاس کے جیتے جاگتے ہنستے روتے چلتے پھرتے کردار نظر آتے ہیں۔ ارشد کے افسانوں کی زبان ان کے کرداروں کی مناسبت سے استعمال کی جاتی ہے جو افسانے کے فنی حسن میں اضافہ کرتی ہے۔ ایک بات کہنی ہے جو میں مسلسل محسوس کر رہی ہوں کہ زبان و بیان کا طریقہ کافی حد تک تبدیل ہو چکا ہے۔ بدلتی ہوئی تہذیب کے کچھ تقاضے ہوتے ہیں۔ نئی تہذیب پرانی تہذیب پر اپنا نیا رنگ چڑھا دیتی ہے۔ اس دور میں گھر سے لے کر بازار اور تعلیم گاہوں سے لے کر تخلیقات تک میں اردو کے ساتھ انگریزی کے الفاظ مستعمل ہو رہے ہیں یعنی مخلوط زبان کا استعمال۔ پہلے فارسی کے الفاظ استعمال کیے جاتے تھے اب انگریزی الفاظ کا استعمال فیشن یا پھر ضرورت بن گئی ہے۔ ارشد منیم کے یہاں بھی یہ چلن رائج ہے۔ ارشد منیم کے افسانوں میں ماحول، فضا اور مناظر بہت فطری انداز میں پیش کیے جاتے ہیں۔ ان کے افسانوں کا آغاز اس طرح ہوتا ہے کہ پڑھنے والا فوراً متوجہ ہو جائے اور تجسس پیدا ہو جاتا ہے کہ اب آگے کیا ہونے والا ہے۔ انجام تک تجسس برقرار رہتا ہے۔ ارشد کے افسانوں کا اختتام اکثر المیہ پر ہوتا ہے۔ قاری افسانے کے کردار میں کھو جاتا ہے اور کرداروں کے دکھ میں غمگین اور اشک بار ہو جاتا ہے۔ ارشد کے افسانے اکثر قاری کو چونکا دیتے ہیں۔ انسانیت کا درد بھی بدرجۂ اتم موجود ہے، مذہبی اور سماجی روایتوں کی پاسداریاں بھی ارشد منیم کے افسانوں میں پائی جاتی ہیں۔ معاشرے میں پھیلے ہوئے انسانیت سوز مسائل سے ہی ارشد منیم اپنے افسانوں کے پلاٹ کا

تانابانا بنتے ہیں۔معاشرے میں کچھ شعبے ایسے ہیں جو عظیم المرتبت اور معتبر اور قابل احترام سمجھے جاتے ہیں مگر افسوس درس وتدریس کا شعبہ ہو یا علاج معالجے کا ہو دونوں شعبوں کے محترم اور پروقار لوگوں نے گزرتے وقت کے ساتھ اپنا وقار اور اعتبار کھودیا ہے۔ بہت پہلے درجہ 9 میں پریم چند کی ایک کہانی منتر پڑھی تھی۔اس کہانی میں احساس اور بے حسی، امارت کی خودغرضی اور غربت کا جو خلوص پیش کیا گیا ہے، بوڑھا غریب جس کو سانپ کا زہر اتارنے کا منتر آتا تھا اس کے منتر کے آگے سائنس کی بے بسی نظر آتی ہے۔ڈاکٹر چڈھا کی مسیحائی کو ان کی دولت کے غرور نے مفلوج کردیا تھا۔ڈاکٹر چڈھا ایک غریب مریض کے علاج کے لئے اس کی جھونپڑی تک اس لئے نہیں جاتا کہ رات بہت ہو چکی تھی، بوڑھے اور غریب باپ کے پاس ڈاکٹر کی منھ مانگی فیس ادا کرنے کے لئے روپئے نہیں تھے اور امیر ڈاکٹر کو اپنے بنگلے سے کسی غریب کی جھونپڑی تک جانا گوارا نہیں تھا۔بوڑھے غریب کا بیٹا اس کی زندگی کا واحد سہارا تھا مگر ڈاکٹر چڈھا کی بے حسی نے اس سے اس کا واحد سہارا چھین لیا، حالانکہ موت اور زندگی عطا کرنے والا صرف خدا ہے مگر اس زمین پر لوگ ڈاکٹر کو مسیحا سمجھتے ہیں، دوسری طرف وہی بوڑھا ڈاکٹر چڈھا کے اکلوتے بیٹے کو موت سے بچانے کے لئے ڈاکٹر چڈھا کے ساتھ آدھی رات کو چل پڑتا ہے۔یہ کہانی اتنی پراثر ہے کہ برس ہا برس گزر جانے کے بعد بھی میرے ذہن سے محو نہیں ہوئی اور جب میں نے ارشد منیم کی کہانی 'پرماتما' کا مطالعہ کیا تو میں نے محسوس کیا جس انسانیت اور بے حسی کی کہانی پریم چند نے تخلیق کی تھی وہ بے حسی اکیسویں صدی میں اور زورآور ہوگئی ہے مگر خوشی کی بات یہ ہے کہ انسانیت اب بھی زندہ ہے۔ پرماتما اور منتر دونوں کہانیوں کے مرکزی خیالات اور پلاٹ ایک جیسے ہیں، ہاں کردار منفرد ہیں، حالات مختلف ہیں، دور دوسرا ہے مگر دولت انسانیت کو کھا جاتی ہے۔انسانیت شاید صرف غریبوں کے پاس بچی ہے۔دونوں کہانیوں کے مابین آٹھ دہائیوں کا فرق ہے۔ایک نئی نسل کا نوجوان افسانہ نگار پریم چند کی طرح پراثر کہانیاں لکھ رہا ہے وہ بھی بغیر پریم چند کی کہانیوں کو پڑھے ہوئے۔ یہ افسانہ نگار کی کامیابی کی ضمانت ہے۔کہانی اچھی ہے یا بری، اعلی درجے کی ہے یا اوسط درجے کی اس کا فیصلہ قارئین اور ناقدین کے ہاتھوں میں ہوتا ہے۔

تصنیفات اور مصنفین کو مقبول بنانا عوام یا قارئین اور ادب کے ناقدین کا کام ہے۔نئی نسل کی تخلیقات اور اس کی خوبیوں اور خامیوں کو پرکھنا بھی ناقدین کی ذمہ داری ہے۔ پریم چند، کرشن چندر، بیدی،منٹو،قرۃالعین حیدر،عصمت یہ سب فکشن کے بنیادگزاروں میں شامل ہیں اورافسانہ نگاری کی بنیاد میں بہت مضبوط ستون کی طرح ایستادہ ہیں۔اب ہمیں اس بنیاد پر تعمیر افسانہ نگاری کی نئی عمارت کی طرف توجہ کرنی چاہئے۔اکیسویں صدی کے فکشن اور تخلیقات کا جائزہ بہت ضروری ہے۔ارشدمنیم موجودہ عہد کے نوجوان افسانہ نگار ہیں اس لئے ان کے افسانوں میں عصری مسائل جابجا موجود ہیں۔مثال کے طور پر عصر حاضر کی سرکاری اسکیم مڈ ڈے میل میں غبن اور گھوٹالے، آشرم اور آدھیاتم کے پس پردہ جنسی استحصال، زنا بالجبر،عصمت دری کے گھناؤنے جرم،شرافت کے نقاب میں چھپا بدمعاش انسان ارشد کے افسانہ ’گنہگار‘ میں دیکھا جاسکتا ہے۔ایک بات جو میں نے شدت سے محسوس کی وہ یہ کہ ارشدمنیم کے افسانوں کے کردارزیادہ تر غیرمسلم ہیں۔جیسے ’خواب خواب زندگی‘ کے کردار ہریا،منی، آلوک، آدرش، بنسی، موہن لال، افسانہ ’ہمدردی‘ کا کرنیل سنگھ،افسانہ ’قبول‘ کا نریندر افسانہ ’گروہ‘ کے کردار دیناناتھ،ارون،بکرم،افسانہ گناہ کے کردار بھولا اور ونود افسانہ پس پردہ کے کردار ڈھونگی سوامی جی اور کملا،افسانہ فنکارہ کی چندرا افسانہ فرض شناس کے کردار بدری،رامو،ریکھا،افسانہ بڑا بجٹ جوفلم میکنگ کے تانے بانے سے بنا گیا ہے،اس کے کرداررتن گھوش اور مدھو،افسانہ بھویشیہ وانی کے کردار جیوتشی رام ساگر اور راکیش،افسانہ پنیہ کے کردار ماسٹر جی،امن،موہن اور ایم۔ایل۔اے صاحب کے ذریعے کئی افسانوں میں سیاست دانوں کی مکروہ چالوں اور داؤ پینتروں کو پیش کرکے سماج اور سیاست کے مکروہ چہرے کوادب کے آئینے میں دکھانے کی کامیاب اور فنکارانہ کوششیں کی گئی ہیں۔جیسے افسانہ اہمیت اور خواب خواب زندگی۔انسان کی سوچ اور خیالات کس طرح حالات کے مطابق تبدیل ہو جاتے ہیں۔ان حالات کو جاننے اور سمجھنے کے لئے ارشدمنیم کا افسانہ حسب ضرورت دل میں درد کا شدید احساس پیدا کرتا ہے۔ یہ افسانہ کی شکل میں دنیا کے زیادہ تر بوڑھے کمزور والدین کی مجبوریوں اور بے بسی کی کہانی ہے۔ افسانہ حسب

ضرورت کا مرکزی کردار گائتری ہے، جس پر اچانک فالج کا شدید حملہ ہوتا ہے، گائتری کا جسم اس بیماری کی وجہ سے معذور ہو جاتا ہے، اور اسی معذوری اور لاچاری نے گائتری کو اپنے اکلوتے بیٹے اور اکلوتی بہو کا وہ روپ دکھایا جس کو ہمارے معاشرے کے زیادہ تر بوڑھے ماں باپ دیکھ رہے ہیں اور اولاد کی بے اعتنائیوں کا زخم دل میں چھپائے جی رہے ہیں۔ بہو کی بے رخی اور بیٹے کی خاموشی نے گائتری کے خیالات کو یکسر تبدیل کر دیا۔ وہ عورت جو بیوی کی موت کے بعد دوسری شادی کرنے والے شوہر کو بے وفا سمجھتی تھی۔ دن رات گھر کے کام کرنے والی، شوہر اور بیٹے کا محبت سے خیال رکھنے والی گائتری جب فالج کے حملے سے معذور ہوئی تو اس نے بہو اور بیٹے کے رویّوں میں ناخوشگوار تبدیلیاں دیکھیں اور محسوس کیں اور اپنے کانوں سے بیٹے اور بہو کے دل شکن خیالات سنے تو گائتری نے اپنے شوہر سے کہا۔ ''آپ کی اچھی پنشن ہے۔ میرے مرنے کے بعد آپ دوسری شادی کر لینا۔''

> ''ارشد منیم کی افسانہ نگاری میں انسانیت، انسانی رشتے، ازدواجی رشتے کی محبتیں، وفا شعاری، بے وفائی، التفات اور بے اعتنائی، رشتوں اور بھروسے کی ٹوٹ پھوٹ احساس اور بے حسی کے تمام رنگ موجود ہیں۔ ارشد منیم بلاشبہ ایک حساس اور سنجیدہ افسانہ نگار ہیں۔ یہ تمام باتیں ہر گھر میں ہر طرف موجود ہوتی ہیں مگر مصنف اور عام انسان میں یہی امتیازی فرق ہے کہ مصنف بیحد حساس ہوتا ہے وہ معاشرے کے پوشیدہ عیوب کو بھی اپنی باریک بینی سے ڈھونڈ نکالتا ہے۔''

(حوالہ ارشد منیم، مجموعہ خون کا رنگ افسانہ حسب ضرورت صفحہ 42)

اسی مجموعہ کا تیسرا افسانہ بیٹا بھی اسی معاشرے کی کہانی ہے جو بوڑھے والدین کی اکلوتی اولاد ہے۔ گاؤں کے غریب ماں باپ کی اکلوتی بیٹی جسے بہت ارمانوں سے تعلیم کے زیور سے آراستہ کیا تھا ملازمت اور روزگار کی تلاش میں شہر میں بھٹکتی، ملازمت ڈھونڈھتی ضعیف

والدین کی کفالت اور ذمہ داریوں کے احساسات وضروریات کے بوجھ کی تاب نہ لا کر جسم فروشی کے گڑھے میں گر جاتی ہے۔ کتنی عجیب بات ہے کہ اسی معاشرے میں نہ جانے کتنی بیٹیاں اپنے بزرگ، کمزور والدین کی کفالت کر رہی ہیں اور اپنے بچوں کی بھی پرورش کرتی ہیں۔ حالات انہیں کہاں سے کہاں پہنچا دیتے ہیں۔ کم تعلیم یافتہ خواتین کبھی سلائی کر کے روزی روٹی کا انتظام کرتی ہیں، کبھی جھاڑو پوچھا، صاف صفائی کا کام کر کے گزارا کرتی ہیں، بوڑھی ماں کو بھی سہارا دیتی ہیں اور اپنے بچوں کو بھی نوالہ کھلاتی ہیں۔ تعلیم یافتہ خواتین دفتروں میں کام کرتی ہیں اور اپنے تحفظ کے لئے معاشرے کے سفید بھیڑیوں سے لڑتی بھی ہیں۔ اور کچھ بیٹیاں بیٹا بن کر سہارا بننے نکلتی تو ہیں مگر کب وہ محبت اور التفات کے دھوکے میں آ کر جنسیات اور جسم فروشی میں ملوث ہو جاتی ہیں ان کے والدین کو پتہ بھی نہیں چلتا۔ خود کو بیچ کر بھی وہ والدین کی بھوک مٹانے کو دو وقت کی روٹیاں، تن ڈھانپنے کو کپڑا اور ان کی ادویات و ضروریات تو پوری کرتی ہیں مگر اس مہذب معاشرے میں ایسے قابل تعلیم یافتہ بیٹے بھی ہیں جنہیں خاندان کا چشم و چراغ کہا جاتا ہے لیکن وہ اپنے ماں باپ کی ضروریات پوری کرنے کے بجائے ان سے ان کی چھت بھی چھین لیتے ہیں اور انہیں اولڈ ایج ہوم یا وردھا آشرم بھیج دیتے ہیں۔ پھر بھی والدین کی اولین خواہش ہوتی ہے کہ ان کے یہاں اولاد نرینہ ہو۔ اکثر والدین خود روکھی سوکھی کھا کر اپنے بچوں اور بالخصوص بیٹوں کو دودھ ملائی کھلا کر بڑا کرتے ہیں، خود ننگے پیر رہ کر بیٹے کو جوتے پہناتے ہیں، ان کو انگلیاں پکڑ کر چلنا سکھاتے ہیں۔ وہی بیٹے بڑے ہو کر والدین کے سر سے سائبان اور پیروں کے نیچے سے زمین کھینچ لیتے ہیں۔ یہ المیہ ہے اس مہذب معاشرے کا جہاں والدین کی بوڑھی نظریں اور کمزور بازو اپنے بچوں کے منتظر ہی رہ جاتے ہیں۔

ارشد منیم کی افسانہ نگاری میں انسانیت، انسانی رشتے، ازدواجی رشتے کی محبتیں، وفا شعاری، بے وفائی، التفات اور بے اعتنائی، رشتوں اور بھروسے کی ٹوٹ پھوٹ احساس اور بے حسی کے تمام رنگ موجود ہیں۔ ارشد منیم بلاشبہ ایک حساس اور سنجیدہ افسانہ نگار ہیں۔ یہ تمام باتیں ہر گھر میں ہر طرف موجود ہوتی ہیں مگر مصنف اور عام انسان میں یہی امتیازی فرق

ہے کہ مصنف بیحد حساس ہوتا ہے، وہ معاشرے کے پوشیدہ عیوب کو بھی اپنی باریک بینی سے ڈھونڈ نکالتا ہے۔ سماج کے ان واقعات کے لئے کردار تخلیق کرتا ہے اور اپنے کردار کو زبان، احساسات، جذبات، حرکات وسکنات فراہم کرتا ہے، اوراسی طرح پیش کرتا ہے جیسا وہ چاہتا ہے اسے فن کاری کہتے ہیں۔ارشد منیم کو افسانہ نگاری کا فن خوب آتا ہے۔مصنف سماج میں رہتا ہے۔ وہ سماج کے مسائل سے بے بہرہ کیسے رہ سکتا ہے؟ ایسے مسائل میں نکاح، طلاق اور حلالہ بھی ہیں جن کا غلط استعمال معاشرے میں برائیاں پیدا کرتا ہے۔ 'منتظر' ایک ایسا افسانہ ہے جو انسانی رشتوں کی محبت کی پاسداریوں اور مسائل سے گھری زندگی کی الجھنوں کو بیان کرتا ہے۔ یہ کہانی ایک ایسے مسلم خاندان کی ہے، جہاں ایک نوجوان شوہر اپنے حالات کی ستم ظریفیوں اور پریشانیوں کو برداشت نہیں کر پاتا اور اپنی وفا شعار بیوی کو ایک لمحے میں طلاق کے طمانچوں سے لہولہان کر دیتا ہے۔اس مذموم فعل کی کارگزاری کے بعد خورشید پچھتاوے کی آگ میں جلتا ہے۔ یہ کہانی طلاق سے شروع ہوتی ہے اور حلالہ پر ختم۔ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جو بہت اذیت ناک اور ناپسندیدہ عمل ہے۔ حاجی احمد علی کی دو اولادیں ہیں خورشید اور پرویز۔خورشید کی خوبصورت، خوب سیرت، خدمت گذار، وفا شعار بیوی حنا اس کہانی کا مرکزی کردار ہے۔ یہ کہانی معاشرتی ہونے کے ساتھ ساتھ نفسیاتی بھی ہے۔خورشید کا حنا کو بغیر کسی شرعی عذر کے طلاق دینا، پھر پچھتاوے کی آگ میں جلنا، حنا سے معافی مانگنا، دوبارہ رشتہ استوار کرنے کے لئے حلالہ کرانا، اپنے چھوٹے بھائی پرویز سے نکاح کروانا، اس سارے معاملے میں حنا کس اذیت سے گزرتی ہے؟ پہلے طلاق پھر عدت پھر نکاح ثانی پھر عدت پھر نکاح، ان تمام مسائل میں حنا کا قصور تو کوئی نہیں تھا مگر سزا حنا کے حصے میں آئی۔خورشید نے بغیر سوچے سمجھے طلاق کا تھپڑ تو جڑ دیا مگر خورشید کا کیا بگڑا؟ ان تمام حالات میں حنا بغیر کسی قصور کے ذلت کے انگاروں پر چلائی گئی۔جسم اور روح تو عورت کی زخمی ہوئی اس تکلیف کا احساس کوئی مرد نہیں کرسکتا۔عورت حیا اور وفا کی مٹی سے بنی ہوئی ہے اور مرد اس وفا اور حیا کا محافظ ہوتا ہے باپ، بھائی اور شوہر کی صورت میں مگر وہی محافظ مرد عورت کے سر سے تحفظ کی چادر کھینچ لیتا ہے اور وفا کی چادر چاک کر دیتا ہے تو اس کے بعد اس

عورت سے زیادہ بے وفا اور بے حیا کوئی ہو بھی نہیں سکتا۔خورشید نے حنا کو اس جرم کی سزا سنائی جو حنا نے کیا ہی نہیں۔حنا نے دو دو مرتبہ عدت کی مدت گزاری۔ سگے دیور سے سابقہ شوہر کی موجودگی میں نکاح کرنا پھر چند روز بعد طلاق کا دھبہ پھر ماتھے پر لگانا، پھر عدت میں رہنا، پھر اپنے سابقہ شوہر کے ساتھ نکاح کے بندھن میں بندھنا کوئی آسان عمل نہیں ہے۔ دو مردوں کے بیچ وہ پس گئی جیسے اناج چکی کے دو پاٹوں کے بیچ پس جاتا ہے۔حنا کو طلاق اور نکاح اور حلالہ کی چکی میں پیسا گیا تو حنا کی وفا بپھر گئی باغی ہوگئی، احتجاجی ہوگئی۔ اس کا دل خورشید سے اس قدر کبیدہ ہوا کہ وہ دوبارہ نکاح کے بعد خورشید کو نہ اپنا سکی اور پرویز کی طرف مائل ہوگئی۔سوال یہ ہے کہ حنا کا جھکاؤ پرویز کی طرف کیوں ہوا؟ اس کا ذمہ دار کون ہے؟ خورشید؟ یا حلالہ؟ یا ہماری جہالت؟ ایک اہم سوال یہ ہے کہ مولوی صاحب نے حلالہ کرنے کا مشورہ یا حکم کیوں دیا؟ خورشید جب رجوع کرنا چاہتا تھا تو طلاق یا حلالہ چہ معنی دارد۔تین ماہ کی مدت سے پہلے ہی اگر شوہر بیوی سے رجوع

”خاموشی بھی ارشد منیم کا ایک نفسیاتی افسانہ ہے جو اس قول کی تردید کرتا ہے کہ خاموشی ہزار بلاؤں کو ٹالتی ہے یا چیخ و پکار سے خاموشی بہتر ہے ہر بار یہ سچ نہیں ہوتا،کبھی کبھی خاموشی کسی طوفان کا پیش خیمہ ہوتی ہے اور خاموشی کے ساتھ بیگانگی شامل ہوجائے تو ازدواجی زندگی کا سکون درہم برہم ہوجاتا ہے اور کبھی کبھی خاموشی اور بیگانگی کا زہر اتنا خطرناک اور اثر دار ہوتا ہے کہ انسان کو موت کی نیند سلا دیتا ہے۔ارشد منیم کے اس افسانے کا انجام بہت المناک ہے۔“

کرلے تو طلاق تو ہوئی نہیں۔قرآن مجید اس معاملے میں کیا کہتا ہے؟ لوگ حافظ،مولوی اور مفتی سے مشورہ مانگتے ہیں مگر ام الکتاب قرآن الحکیم سے استفادہ کرنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے؟ اس کہانی میں نفسیاتی پہلو بھی ہے،اگر انسان کو بلا وجہ سزا دی جائے یا اس کی روح پر ضرب لگائی جائے تو احتجاج اور بغاوت فطری عمل ہے۔انسان مرد ہو یا عورت جب باغی ہو جائے تو مذہب، روایت، محبت، سب کو طاق پر رکھ دیتی ہے۔جیسا کہ حنا نے حلالہ کے بعد کیا۔خورشید حنا کی نظر سے ہی نہیں دل سے بھی اتر گیا۔اس نفسیاتی پہلو پر ارشد منیم کی ایک اور کہانی ''خواہش'' بھی ہے جو مکمل طور پر ایک نفسیاتی کہانی ہے۔خواہش کا مرکزی کردار ایک بچہ ہے جس کا نام انکش ہے۔انکش کب اور کس لمحے نفس کے دباؤ میں آجاتا ہے اور اس کے اندر جنسی خواہش سر ابھارنے لگتی ہے۔کہانی پڑھنے سے جو نفسیاتی پہلو سامنے آتا ہے وہ یہ کہ ضروری نہیں کہ بچوں میں عورتوں کو عریاں دیکھ کر یا ٹی وی سیریل کے بےہودہ مناظر یا فلموں کے نیم برہنہ کرداروں کو دیکھ کر نفسانی خواہشات پیدا ہوں بلکہ انسان کا نفس ہر پل تیار اور بیدار رہتا ہے بس اسے کسی ایک کمزور لمحے کی ضرورت ہوتی ہے،کوئی چھوٹا منظر،کوئی مدھم سی سرگوشی،کوئی سسکاری اور تنہائی کا کوئی ایک لمحہ جو بچہ کو جوان اور انسان کو حیوان بنانے کے لئے کافی ہوتا ہے۔جیسا کہ انکش کے ساتھ ہوتا ہے۔خاموشی بھی ارشد منیم کا ایک نفسیاتی افسانہ ہے جو اس قول کی تردید کرتا ہے کہ خاموشی ہزار بلاؤں کو ٹالتی ہے یا چیخ و پکار سے خاموشی بہتر ہے۔ہر بار یہ سچ نہیں ہوتا،کبھی کبھی خاموشی کسی طوفان کا پیش خیمہ ہوتی ہے اور خاموشی کے ساتھ بیگانگی شامل ہو جائے تو ازدواجی زندگی کا سکون درہم برہم ہو جاتا ہے اور کبھی کبھی خاموشی اور بیگانگی کا زہر اتنا خطرناک اور اثردار ہوتا ہے کہ انسان کو موت کی نیند سلا دیتا ہے۔ارشد منیم کے اس افسانے کا انجام بہت المناک ہے۔شکیل کی خاموشی اور بیگانگی اور بڑھتے فاصلے اس کی بیوی کو ذہنی مریضہ بنا دیتے ہیں اور افسانے کا انجام خودکشی پر ہوا۔ازدواجی رشتوں میں پردہ داری، پرائیویسی، دوری اور ڈسٹینس یا اسپیس رشتہ کو مضبوط نہیں بلکہ کمزور اور انسان کو ذہنی مریض بنا دیتے ہیں جیسا کہ شکیل کی بیوی کے ساتھ ہوا۔

احساس جرم ہمارے سماج کی ایسی دردانگیز اور سبق آموز کہانی ہے جو ہر طرف بکھری

ہوئی ہے۔اعلی طبقے اور تعلیم یافتہ گھرانوں میں زیادہ عام ہے۔بیٹیوں کی نسل کشی کر کے جو والدین بیٹوں کی پیدائش پر خوش ہوتے ہیں اور اپنی زندگی کی ساری جمع پونجی اپنے بیٹوں کو سونپ کر ان کے دست نگر بن جاتے ہیں اور اکثر و بیشتر ان ہی بیٹوں کے لئے بیوی بچوں اتنے پیارے ہو جاتے ہیں کہ ماں باپ کی جائیداد حاصل کرنے کے بعد ان کو اولڈا ایج ہوم، دارالامان، اور وردھا آشرم پہنچا دیتے ہیں کہ ان کی کوئی خدمت نہیں کر سکتا، ان کو کوئی وقت نہیں دے سکتا۔ یہ افسانہ محض کہانی یا افسانہ نہیں ہے سماج کا آئینہ ہے۔ہم جس صدی میں جی رہے ہیں یہ رشتوں کے ٹوٹ پھوٹ اور تہذیب اور اقدار کے زوال کی صدی ہے۔ارشد منیم اکیسویں صدی کے افسانہ نگار ہیں، ان کی کہانیاں اسی معاشرے کا عکس ہیں اور ان کے حساس ذہن کی تخلیق ہیں۔ان کے تمام کردار بہت مانوس اور اپنے ہی ارد گرد کے معلوم ہوتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں جذبات کم احساسات زیادہ ہیں جو محسوس کیے جا سکتے ہیں، رومان اور تصورات کے بجائے احساس اور حقیقی رنگ زیادہ غالب ہے۔ ان کے افسانوں کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک حساس افسانہ نگار ہیں اور ان کا مشاہدہ بہت گہرا ہے۔معاشرے کے تمام مسائل خواہ وہ خارجی ہوں یا خانگی، سیاسی ہوں یا سماجی مذہبی ہوں یا جنسی بزرگوں کے ہوں یا بچوں کے نوجوانوں کے مسائل ہوں یا خواتین کے، ساس بہو کے مسئلے ہوں یا شوہر بیوی، ماں بیٹے کا مسئلہ ہو سب پر گہری نظر ہے اور حقیقت کو افسانہ بنانے کا ہنر ان کے پاس بدرجۂ اتم موجود ہے۔افسانے کو حقیقی رنگ دینا بھی ان کی فنکاری کا ثبوت ہے۔ جیسے ان کا افسانہ خون کا رنگ افسانہ ہوتے ہوئے حقیقت معلوم ہوتا ہے۔ یہ افسانہ نگار کی فنی مشاقی ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ ارشد منیم ایک اوریجنل اور فطری تخلیق کار ہیں کیونکہ انھوں نے اردو زبان کو باقاعدہ نہیں پڑھا، اس کی تہذیب و ثقافت سے بھی نا آشنا تھے۔ادب کے آداب اور فن کے رموز کی کلاس بھی نہیں کی۔ان کے پاس نہ اعلیٰ ڈگریوں کا انبار ہے نہ ادب کے درس و تدریس کا تجربہ۔ وہ تجارت پیشہ انسان ہیں، دن بھر اپنے گاہکوں کے بیچ دو- دو چار کر کے حق، حلال کی روزی روٹی کا انتظام کرتے ہیں مگر ادب کی تخلیق کے لئے جس بیدار ذہن، گہرے احساسات اور عمیق مشاہدے کی ضرورت ہوتی

ہے وہ ذہین دماغ اور حساس دل اور تیز نگاہ ارشد منیم کے پاس موجود ہے۔'لاوا' ارشد منیم کی کہانیوں کا تیسرا مجموعہ ہے۔

یہ افسانوی مجموعہ پنجاب اردو اکادمی کے مالی تعاون اور ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی سے شائع ہوکر سن 2021 میں منظر عام پر آچکا ہے۔ 112 صفحات پر مشتمل اس مجموعے میں ارشد منیم کی سولہ کہانیاں شامل ہیں اور اس کتاب کی قیمت بھی بہت مناسب ہے مبلغ ایک سو بارہ روپئے۔ "لاوا" کا انتساب ارشد منیم کے دو بھائیوں اظہر منیم، اشرف منیم اور پیارے دوست ناصر آزاد کے نام ہے۔ اس میں ارشد منیم کے استاد اور مشہور و معروف فکشن نگار، ناقد، مترجم اور افسانہ کلب کے روح رواں محترم بشیر مالیرکوٹلوی کی تحریر ہے جو ارشد منیم کی افسانہ نگاری کو متعارف کرا رہی ہے۔ لاوا ٹائٹل افسانہ ہے، یہ کہانی عہد کورونا میں ہونے والی ایک ایسی ماں کی موت کی دردناک کہانی ہے جس میں ایک بیٹی جس کا نام ندھی ہے بھگوان سے ماں کی زندگی کی بھیک مانگتی ہے، نرس اور ڈاکٹروں کے سامنے بھی گڑگڑاتی ہے، اپنی بیمار ماں کو بچانے کی جان توڑ کوشش کرتی ہے، آکسیجن کی کمی ہونے پر وہ کورونا کے تمام پروٹوکول بھلا کر اپنی ماں کو اپنے منھ سے سانس دیتی ہے۔ یہ کہانی ماں اور بیٹی کی بے لوث اور بے غرض محبت کی کہانی ہے جو آج کے دور میں کم یاب ہوگئی ہے اور کورونا کی بیماری میں رشتوں کی بے گانگی اور بے حسی تو عروج پر تھی ہی انسانیت بھی شرمسار ہو رہی تھی، ایسے میں ارشد منیم ایک ایسا کردار پیش کرتے ہیں کہ وہ یہ بتا سکیں کہ دنیا میں ابھی بھی انسانیت باقی ہے۔ اچھی اور بے غرض اولادیں بھی ہیں اور ساتھ ہی سیاست، طبابت، اور سرکاری نظام کی خامیوں کو بھی برہنہ کیا ہے۔ اس کہانی میں رہنماؤں کے جھوٹ اور سرکاری نظام کی خامیوں کو بھی برہنہ کیا ہے۔ لاوا ارشد منیم کی اچھی کہانی ہے۔

❖❖❖

DR.KAHKASHAN IRFAN
577/A NEAR DURGA POOJA GROUND
BESIDE AASHIRWAD ENTERPRISES
SHAH GANJ, PRAYAGRAJ U.P. 211003
email-dr.kahkashanirfan1980@gmail.com

غلام قادر

ظفر گورکھپوری کی شاعری

بیسویں صدی کی اردو شاعری نے ادب کے مزاج کو نیا رنگ وروپ عطا کیا، اس نے کلاسیکی، ترقی پسند، جدید اور مابعد جدید جیسے مختلف طرز ہائے فکر کو اپنایا ہے۔ ہر انداز کے پس پشت ایک فکری رجحان کارفرما رہا جس نے ادب کو ایک نئی راہ دکھانے کے ساتھ ساتھ اپنے رنگ وآہنگ کو بھی ظاہر و ثابت کیا۔ ظفر گورکھ پوری نے ان مختلف فکری تحریکوں کو ایک ساتھ ملا کر اپنی شاعری میں ایک ایسا انداز اپنایا جس میں روایت اور جدت دونوں شیر وشکر ہو گئے۔ اگر ان اسلوب کی درجہ بندی کی جائے تو بآسانی ظفر گورکھ پوری کو ترقی پسند شاعر کے طور پر جانا، پہچانا جاسکتا ہے۔ کیوں کہ انھوں نے اپنی شاعری میں عام لوگوں، مزدوروں، بے سہارا اور کسانوں کو پیش آنے والے مسائل کو بیان کیا ہے۔ یہ موضوعات نوجوانوں کے خوابوں اور جدوجہد کو ایک نئی سمت عطا کرتے ہیں، اسی انداز نے انھیں عوامی شاعر بنا دیا ہے۔

ظفر گورکھ پوری کی پیدائش بانس گاوں، ضلع گورکھ پور میں، ۵مئی ۱۹۳۵ کو ہوئی، وہ بچپن میں ہی ممبئی چلے گئے تھے، وہیں تعلیم وتربیت کے بعد ملازم ہو گئے اور ان کا انتقال ۳۰/جولائی ۲۰۱۷ کو ممبئی میں ہی ہوا۔ ان کے شعری مجموعوں میں تیشہ: ۱۹۶۲، وادی سنگ: ۱۹۷۵، گوکھرو کے پھول: ۱۹۸۶، چراغِ چشمِ تر: ۱۹۸۹، زمین کے قریب: ۲۰۰۱، ہلکی ٹھنڈی تازہ ہوا: ۲۰۰۹، اور مٹی کو ہنسانا ہے: ۲۰۱۲، شامل ہیں۔

ظفر گورکھ پوری نہ صرف عوامی مسائل سے واقف تھے بلکہ دنیا بھر میں ہونے والی سیاسی، سماجی اور معاشی تبدیلیوں سے بھی آگاہ تھے۔ ان کی شاعری میں ہمیں ایسے موضوعات ملتے ہیں جو عالمی سطح پر ہونے والی ناانصافیوں، جنگوں اور عوامی استحصال کے خلاف احتجاج کرتے ہیں۔ شاعر ماہرِ فن ہونے کے ساتھ ساتھ ان عناصر سے ہم آہنگ ہو تو لطف کی ایک

اورصورت پیدا ہو جاتی ہے۔سادگی اورعصری ماحول سے ان کی شاعری پر ہے۔انھوں نے پیچیدہ الفاظ، غیر مانوس محاورے،اورعربی و فارسی کے بھاری بھرکم جملوں سے احتراز کیا ہے۔ان کے یہاں الفاظ اس قدر سادہ ہیں کہ براہِ راست دل سے بات کرتے ہیں۔

''زمین کے قریب'' کی پہلی نظم ''دعا'' ہے۔جس میں انھوں نے آسان لفظوں میں خدا کی نعمتوں کا اعتراف کیا ہے وہیں انسان کی غیر انسانی حرکتوں کا ذکر بھی کیا ہے اور ایک شاعر کی حیثیت سے سماج کے نمائندہ کے طور پر خود کو پیش کیا ہے۔بند ملاحظہ کریں:

خدائے برتر و بالا
ترا ممنون ہوں، کیا کیا عطا کیں نعمتیں تو نے
مری اوقات سے بھی کچھ زیادہ دے دیا مجھ کو
مگر
میں ایک ایسا خود غرض، ناشکر و نافرماں
کہ سب کچھ پا کے بھی نامطمئن ٹھہرا
مرے لالچ نے
مٹی، دھوپ، پانی
ثمر، دریا، ہوائیں، پیڑ
سب کو قتل کر ڈالا

(زمین کے قریب،ص۵)

نظم کا پہلا ٹکڑا جس میں اس بات کا اقرار کیا گیا ہے کہ خدا کی ذات برتر و بالا ہے، جس کی نعمتیں بے شمار ہیں، اس کے بعد کا حصہ اعترافِ جرم ہے یعنی انسانوں نے خود بگاڑ پیدا کیا ہے ماحولیاتی تبدیلی میں بہت بڑا ہاتھ انسان کا ہے کہ اس نے درختوں کو کاٹ ڈالا، پہاڑوں کو محلات میں تبدیل کر ڈالا جس کی وجہ سے آلودگی خطرناک حد تک پہنچ گئی۔ انسان بظاہر حساس بن رہا ہے مگر حقیقت کچھ اور ہی ہے۔اس کی وضاحت دوسرے بند میں یوں کی گئی ہے کہ:

مرے الفاظ مصنوعی ہیں سارے
میں ہر پہچان اپنی کھو چکا ہوں
نہ چہرہ ہے، نہ آنکھیں
دماغ اکثر یہ مجھ سے پوچھتا ہے
کیا حقیقت میں وہی ہوں میں
فرشتوں نے جسے سجدے کئے تھے
نہیں، میں وہ نہیں ہوں۔

اس بند میں انسانیت کو آئینہ دکھایا جا رہا ہے کہ بنی نوع انسان کو اس عمل سے باز آ جانا چاہیے اور شاعر تمام انسانوں کا نمائندہ بن کر اعترافِ جرم کے بعد ہدایت کا متمنی ہے اور رب کی بارگاہ میں یوں دعا گو ہے کہ:۔

خدائے برتر و بالا
مرے تاریک۔خالی۔۔خود گزیدہ
سرد سینے کو
عطا کر آگ
اس کو درد کی خوشبو سے بھر دے
مجھے پھر اشرف المخلوق کر دے

(ایضا،ص۵)

اس بند کے ذریعے شاعر نہ صرف اپنی ذات کی بات کر رہا ہے بلکہ وہ پوری نسلِ آدم کے لئے انسانیت کا طالب ہے۔وہ اپنے خالق سے صرف اتنی ہی التجا کر رہا ہے کہ ظاہری گوشت، پوشت، چلتے، پھرتے انسانوں کو انسانی خصلتوں کا حامل بنا دے۔اور یہی شاعر کی خوبی بھی ہے کو وہ سماج کے ہر فرد کی اصلاح کا خواہاں ہو۔اس گہرے جذبات کے باوجود شاعر اپنے لئے کچھ نہیں ڈھونڈھتا ہے بلکہ یہ بتاتا ہے کہ حقیقی انسانیت ذاتی خواہشات کے زیراثر نہ ہونے میں مضمر ہے۔

ظفر کی شاعری کی ایک خوبی یہ ہے کہ وہ غمِ ذات کو غمِ کائنات بنا دیتے ہیں۔ چنانچہ اس کے متعلق عنوان چشتی کا یہ قول قابل ذکر ہے کہ:

''ظفر گورکھ پوری نے اپنی جذباتی کیفیتوں، خوں آشام ارمانوں اور مجروح تمناؤں کی بول چال کو ہری بھری۔۔۔۔زبان میں اس طرح پیش کیا ہے کہ شاعر کا ہر تجربہ سطحِ ذہن پر مشک نافے کی طرح اپنے معنی اور تاثر کا انکشاف کر دیتا ہے۔''

(بحوالہ سہ ماہی انتساب، ظفر گورکھ پوری نمبر، ص ۵۱۲)

ظفر نے اپنے دکھ، درد اور غم کا ذکر کیا ہے۔ ان کا لہجہ بھی انھیں منفرد مقام دلاتا ہے۔ ان کی نظموں کے کچھ بند دیکھیں جو غم کی مکمل تصویر بیاں کرتے ہیں:

مرے کاندھوں پہ تم اب بھی ہو
لیکن
تمھاری جاگتے
اور مسکرانے والی آنکھوں میں
بہت گہری
بہت ہی بے کراں سی نیند ہے اب کے
تو کیا تم اب نہیں اٹھو گے
بالوں سے نہیں کھیلو گے میرے
کہو گے کچھ نہ اب کانوں میں چپکے سے
مرے کاندھوں کی قسمت ہی کچھ ایسی تھی

یہ شاید
جسم سے اب تک اسی خاطر جڑے تھے
تمہارا پھول سا بچپن جو نہی اُترے
اٹھالیں یہ جنازے کو تمہارے

جنازے میں اکیلے تم نہیں ہو
تمہارے ساتھ میری لاش بھی ہے
مگر میں چل رہا ہوں
مجھے حیرت ہے، کیسے چل رہا ہوں
زمیں ہے پاؤں کے نیچے
نہ کوئی رہ گذر زندہ
نہ میرے دست و پا زندہ نہ میرے بال و پر زندہ
اگر زندہ ہے کچھ تو اِک چراغِ چشمِ تر زندہ

(چراغِ چشمِ تر، ص ۲۶)

"ظفر گورکھ پوری نہ صرف عوامی مسائل سے واقف تھے بلکہ دنیا بھر میں ہونے والی سیاسی، سماجی اور معاشی تبدیلیوں سے بھی آگاہ تھے۔ان کی شاعری میں ہمیں ایسے موضوعات ملتے ہیں جو عالمی سطح پر ہونے والی نا انصافیوں، جنگوں اور عوامی استحصال کے خلاف احتجاج کرتے ہیں۔"

اس پوری نظم میں درد کی کیفیت کو ایک نئے انداز میں پیش کیا گیا ہے، حیرت و استعجاب کی صورت کے ساتھ ساتھ خود کلامی کی شکل نے اس کو مزید گہرا بنادیا ہے۔یہ نظم دل کی بے چینی، درد اور امید کے امتزاج کو پیش کرتی ہے۔اس کے اشعار سادہ مگر معنی خیز ہیں جو قاری پر شدتِ غم کو نمایاں طور پر واضح کرتے ہیں۔اسی طرح کی کیفیت ان کی نظم ''قرض مٹی کا''میں بھی دکھائی دیتی ہے۔نظم دیکھیں:

مرے ہاتھوں میں بیٹے کچھ نہیں
تھوڑی سی مٹی ہے
زمیں کہتی ہے یہ مٹی تمھارے جسم پر رکھ دوں
صلہ دے دوں تمہیں چوبیس برسوں کی محبت کا

چکادوں سب تمھارے قرض اس تھوڑی سی مٹی سے
کبھی جب لڑکھڑایا میں
مِری لاٹھی بنے تم
گزرتی عمر کے لمحے، جب اپنی گرد لے کر
مِری پلکوں پہ لپکے، اور یہ چاہا
لوئیں بینائیوں کی توڑ لیں ساری
چمک اُٹھے
مِری آنکھوں میں روشن حرف بن کر تم
مری بدنامیوں
ناکامیوں
رسوائیوں کا زہر تھا جتنا
اُسے اک۔۔۔سانس میں
سب پی لیا تم نے
تمھارا اتنا سارا قرض
اس تھوڑی سی مٹی سے چکادوں گا
یہ ممکن ہی نہیں بیٹے
ابھی کارِ جہاں کچھ اور باقی ہے
مجھے گھر لوٹ جانے دو

(چشمِ تر، ص۲۲۔۲۳)

یہ پوری نظم غم کی مکمل تصویر ہے اور شاعر نے اس درد کو بیان کرنے کا جو طرز اپنایا ہے وہی اس کی فن کارانہ صلاحیت کی خوبی ہے۔ شاعر نے اپنی اولاد کے غم کو جس طریقے سے پیش کیا ہے وہ ذاتی غم ہونے کے ساتھ ساتھ اجتماعی غم کی شکل میں تبدیل ہو گیا ہے۔ اس تعلق سے سردار جعفری نے لکھا ہے کہ:

''ظفر نے ذاتی غم کو کائناتی غم بنا دیا ہے۔ اور یہی اچھی شاعری کی خصوصیت ہے۔ اسی طرح درد کا اظہار انسان کو درد سے بلند کر دیتا ہے۔ یہ وہ عمل ہے جس کو تزکیۂ نفس (Catharsis) کہا جاتا ہے۔''

(بحوالہ سہ ماہی انتساب، ظفر گورکھ پوری نمبر، ص ۴۲۱)

ظفر کی شاعری ترقی پسند نظریئے کی حامل رہی ہے اسی لئے انھوں نے اپنی شاعری میں 'ذات' یا 'تنہائی' اور 'وصال و ہجر' جیسے موضوعات کو کم بیان کیا ہے۔ زیادہ تر وہ موضوعات رہے ہیں جو عوام سے براہِ راست منسلک ہوتے ہوں۔ اس ضمن میں سرمایہ داری اور غربت کے مسائل سے خود کو الگ نہیں رکھا۔ ان کا یہ بند ملاحظہ کریں:

بھوک کی برچھیاں اگائے ہوئے
نرم شاداب زخم کے پودے
چیت بیساکھ مجرموں کی طرح
چپ کھڑے ہیں نظر جھکائے ہوئے
زندگی کیا ہے کشت ویراں ہے

(وادیِ سنگ، ص ۳۳)

ہندوستان میں کاشت کاری بڑے پیمانے پر کی جاتی ہے اور کافی مقدار میں غلہ اگایا جاتا ہے، جسے نہ صرف اندرون ملک بلکہ بیرون ملک بھی بھیجا جاتا رہا ہے، جس سے سرکار اور پرائیویٹ کمپنیاں لاکھوں کا منافع حاصل کرتی ہیں مگر کسانوں کو فصلوں کی مناسب قیمت تک میسر نہیں ہوتی ہے۔ بارش نہ ہونے سے فصلوں کا نقصان ہو جاتا ہے اور حکومت کی جانب سے کچھ خاص امداد بھی جاری نہیں ہوتی جس کی وجہ سے کسانوں کی زندگی اجیرن ہو جاتی ہے۔ اس پورے مسئلے پر ظفر گورکھ پوری کے اظہار کی یہ صورت دیکھیں:

دیکھتی ہے سمندروں کی طرف
کبھی تکتی ہے ابر پاروں کو
اپنی سوکھی زباں دکھاتی ہے

بدلیوں کو کبھی پھواروں کو
اور تڑپ کر پکارتی ہے کبھی
ندّیوں، جھیلوں جوئباروں کو
کوئی دو بوند تک نہیں دیتا
اس کے سینے کے شعلہ زاروں کو
دور سے گھورتی ہیں برساتیں
رحم آتا نہیں بہاروں کو
زندگی کیا ہے کشت ویراں ہے

اوراخیر کے بند میں واضح طور پر کسانوں کی بے بسی کا بیان ہے۔ بند دیکھیں:

اور ہم سب ستم زدہ دہقاں
یوں زبوں حال مضمحل گریاں
پاؤں کے آبلوں کو دیکھیں گے
کب تلک بادلوں کو دیکھیں گے
زندگی کیا ہے کشت ِ ویراں ہے

(وادیِ سنگ، ص ۳۸)

ظفر نے نہ صرف اپنی نظموں میں بلکہ غزلیہ شاعری میں ان جیسے موضوعات کو پیش کیا ہے۔ان کی غزل کے چند اشعار دیکھیں:

مرا قلم، مرے جذبات مانگنے والے
مجھے نہ مانگ، مرا ہاتھ مانگنے والے
یہ لوگ کیسے اچانک امیر بن بیٹھے؟
یہ سب تھے بھیک مرے ساتھ مانگنے والے

(گوکھرو کے پھول، ص ۲۳)

یہ سازشیں ہیں ندی کی سراب والوں سے

لہو بھی چھین لو پانی کے خواب والوں سے
میں سچ ہوں شہر کے فٹ پاتھ پر ملوں گا کہیں
مجھے خرید پرانی کتاب والوں سے
(گوکھرو کے پھول،ص۳۸)

....

دیکھیں قریب سے بھی تو اچھا دکھائی دے
اک آدمی تو شہر میں ایسا دکھائی دے

(ایضاً،ص۶۳)

....

کتنی آسانی سے مشہور کیا ہے خود کو
میں نے اپنے سے بڑے شخص کو گالی دی ہے

ظفر گورکھپوری کی مکمل شاعری سراپا احتجاج نظر آتی ہے۔وہ عوام کی پریشانیوں کا ذکر پرزور لہجے میں کرتے ہیں اور سماج کے ہر اس دکھ کو بیان کرتے ہیں جس کے لوگ شکار ہوئے۔اسی ضمن میں ہمارے ملکِ عزیز کا ایک دردناک المیہ رہا ہے کہ یہاں فرقہ وارانہ فسادات ہوئے۔اس کی وجہ خواہ مذہب بنا یا علاقہ،زبان یا نسلی تعصب۔ظفر کا نقطۂ نظر اس حوالے سے بھی بہت واضح ہے۔وہ اس عمل کو نا قابلِ برداشت قرار دیتے ہیں۔بند دیکھیں:

بولی
بھاشا
نسل اور رنگت
خطہ،کلچر،مذہب،ملت
لاکھ سرحدیں،لاکھ حصاریں
قدم قدم لاکھوں دیواریں
ہر دیوار تلے اک نگری

ہر نگری میں کئی نگر
گاؤں گاؤں میں گاؤں ہزاروں
گلی گلی اک دیس نیا
روپ انوکھے
بھیس نیا

(وادیِ سنگ، ص،۲۰)

اور پھر شاعر نے اس فساد کو دیمک قرار دیا ہے کہ اس سے کچھ لوگوں کو وقتی فائدہ حاصل تو ہوسکتا ہے مگر اس سے ملک کو صرف اور صرف نقصان ہی ہوگا۔ اس کو یوں بیان کیا ہے:

مالِ غنیمت دھرتی ساری، ٹکڑا ٹکڑا بانٹ چکے
دیمک بن کر نیل گگن کے سارے تارے چاٹ چکے
نفرت کی تلوار سے مجھ کو اور کہاں تک کاٹو گے
میرا آنگن بانٹنے والو، میرا غم کب بانٹو گے

(وادیٔ سنگ، ص۲۰)

ساتھ ہی ساتھ اس بات کی طرف اشارہ بھی ہے کہ نفرت کی کوئی تو حد ہونی چاہیے اور تقسیم صرف نفرت ہی کو کیوں کیا جا رہا ہے؟ لوگوں کا درد وغم بھی تو بانٹا جانا چاہیئے۔ دراصل یہ طنز بھی ہے ان لوگوں پر جو اس ناپاک عمل میں ملوث ہوتے ہیں۔

ترقی پسند شعرا کی ایک لمبی فہرست ہے، جنھوں نے وطن کی آزادی کے لئے نوجوانوں کو جوش دلایا تو دوسری جانب وطن کی محبت میں سرشار ہو کر اس کے گن گائے۔ ظفر کیوں کر اس سے اپنے آپ کو دور رکھ سکتے تھے۔ ان کا یہ بند دیکھیں:

مرا وطن
یہ دور تک ہمالیہ کے برف پوش سلسلے
یہ سبز وادیوں میں شوخ ہرنیوں کے قافلے
یہ پر بہار راستے یہ خوش گوار مرحلے

تھرک رہی ہے جسم پر ہوا گلال سا مَلے
اِسی ہوا سے پیار ہے یہی ہوا عزیز ہے
میرے وطن مجھے تری ادا ادا عزیز ہے

(وادیٔ سنگ، ص ۱۳۷)

ظفر پوری زندگی گنگا جمنی تہذیب کے قائل رہے۔ مختلف مذاہب، مختلف تہذیب و تمدن جو کہ اس ملک کی خوبصورتی ہے۔ اس پر ان کو فخر تھا۔ ملک ہندوستان ہر ذات اور مذہب کی آماجگاہ رہی ہے۔ اسے یوں بیاں کیا ہے:

یہ اکبرؔ و اشوکؔ و چشتیؔ و کبیرؔ کا وطن
یہ گوتمؔ و کرشنؔ و نانکؔ و نظامؔ کا چمن
یہ کالیداسؔ و غالبؔ و نظیرؔ کی ہے انجمن
فراقؔ و جوشؔ کے کلام میں اسی کا بانکپن
یہ خاک جس کی انکھڑیوں کا ہر نشہ عزیز ہے
مرے وطن مجھے تری ادا ادا عزیز ہے

(وادیِ سنگ، ص ۱۳۸)

ایک طرف جہاں وطن کے ہر ذرے سے محبت کا اظہار کیا ہے تو یہ بھی کہا کہ ہم اس کی عظمت پر کسی طرح آنچ نہیں آنے دیں گے اور اس کی حفاظت کے لئے ہمہ وقت کوشاں رہیں گے اور اس کی وضاحت یوں کی ہے:

ہم اس وطن کو نفرت و عناد سے بچائیں گے
نفاق کے سروں کو اتحاد سے جھکائیں گے
ہم اس زمیں کے لال ہیں اسی کے کام آئیں گے
فرازِ دار پہ بھی ہم وطن کے گیت گائیں گے
وطن کے نام پر ظفر ہمیں قضا عزیز ہے
مرے وطن مجھے تری ادا ادا عزیز ہے

(وادیِ سنگ، ص۱۳۹)

ظفر گورکھ پوری کی شاعری میں جہاں زندگی کے مسائل کا ذکر نئے طرزِ فکر کے ساتھ کیا گیا ہے، وطن کی محبت، گاؤں کی مٹی کی چاہت اور سماجی رکھ رکھاؤ سبھی کو عمدہ طریقے سے پیش کیا گیا ہے، وہیں بے ایمانی، جبر و استحصال اور غریبوں، مزدوروں پر ہونے والے مظالم کا ذکر بھی ملتا ہے۔ ان کی نظمیں اور غزلیں سماجی مسائل کی آئینہ دار ہیں اور عمدہ اسلوب، بہترین پیش کش ان کی فنی خوبیوں کا کمال ہے۔لفظیات، علامات، لہجہ اور جدید تشبیہات و استعارات کی تناظر میں بھی تنوع اور وارفتگی پائی جاتی ہے، جو انھیں ایک با کمال شاعر ہونے کی سند فراہم کرتی ہے۔ان کی شاعری میں ادب کے بہت سے قیمتی ذخائر موجود ہیں، جو کہ اہل ادب کی توجہ کو اپنی جانب کھینچتے ہیں، جس کی وجہ سے ظفر کی شاعری ترقی پسندی کی توسیع معلوم ہوتی ہے۔

❖❖❖

GHULAM QADEER
Research Scholar
Department of Urdu
AMU, Aligarh (UP)-202002
Mob-880216418

تخلیق کاروں سے گزارش

- ❖ سہ ماہی ''اکادمی'' کے لئے معیاری نگارشات ہی ارسال کریں۔ ہر تخلیق پر غیر مطبوعہ کی تصدیق ہونا لازمی ہے۔ساتھ ہی مکمل ایڈریس، موبائل نمبر بھیجیں۔
- ❖ ای۔میل سے بھیجی ہوئی نگارشات کا پروف اچھی طرح پڑھ لیں، اِن پیج فائل کے ساتھ پی ڈی ایف بھی بھیجیں۔
- ❖ تخلیقات کے ساتھ بینک اکاؤنٹ میں درج نام، بینک کا نام، شاخ کا نام، آئی۔ایف۔ ایس۔سی نمبر انگریزی میں لکھ کر بھیجنا ضروری ہے، پاس بک کی فوٹو کاپی یا کینسل چیک بھی منسلک کرنے کی زحمت کریں۔

Vol.-22 Issue No. 3 January - March 2025
उत्तर प्रदेश उर्दू अकादमी पत्रिका
اُتر پردیش اردو اکادمی مجلہ

اُتر پردیش اُردو اکادمی کی نئی کتابیں

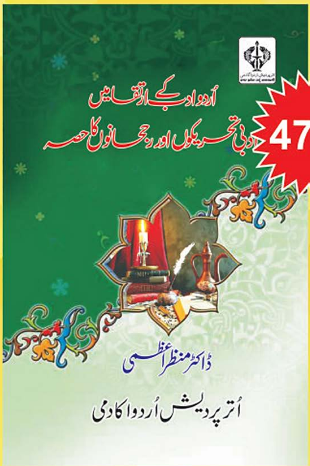

475/-

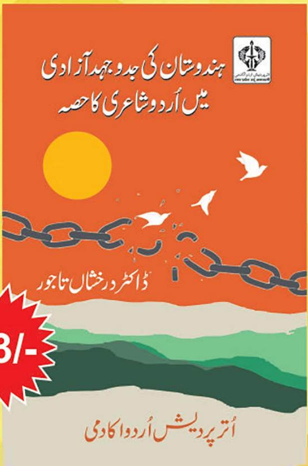

603/-

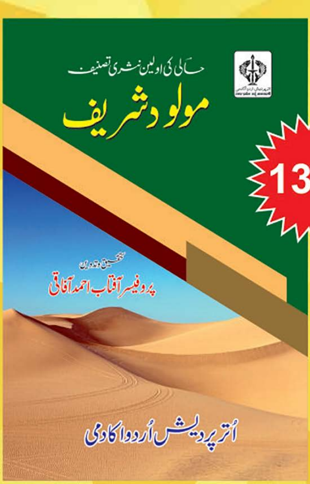

131/-

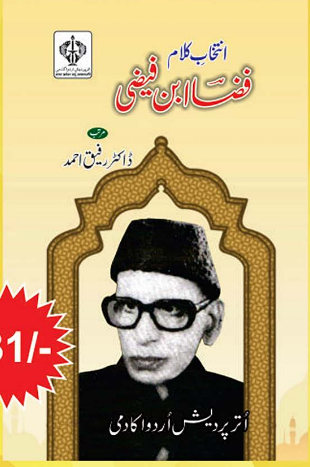

131/-

رابطہ کریں

سکریٹری، اتر پردیش اردو اکادمی، وبھوتی کھنڈ گومتی نگر، لکھنو-226010

سیل ڈپو : 9450450484